ایک چادر میلی سی

راجندر سنگھ بیدی

۲۸۵۸۶

سٹار پاکٹ بکس

"سسرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دولہن کا۔ اُس کے سواگت کیلئے گھر کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل گرانے کا، پیچھے باجوں، آگے نظروں کے ٹھٹھے کا، ساس کے چاؤ، سسر کے ملہار کا ... دیئے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر کھل جانے کا ... ـــــــ لیکن تلو کا جہاں اُسے ہر روز دلتا، روندتا ہوا لے جاتا تھا وہ تو سسرال نہ تھی!"....

ایک چادر میلی سی

راجندر سنگھ بیدی

سٹار پاکٹ سیریز

ایک چادر میلی سی

ناشر:
سٹار پبلیکیشنز، دریا گنج، دہلی ۶

سول ایجنٹس:
پنجابی پستک بھنڈار، دریبہ کلاں دہلی ۶

قیمت صرف دو روپئے ۲

طابع: پربھات آفسٹ پریس دہلی ۶

EK CHADAR MAILI SI : RAJINDER SINGH BEDI . 2.00

پیش لفظ

امر کتھا سنتی ہوئی پاربتی اونگھ گئی۔ شیو جی نے دیکھا بھی۔ مگر بھانگ اور دھتورے کی مستی میں، اپنی بات کہتے گئے۔ جو گپھا میں اوپر کہیں بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری کے جوڑے پربودھ اور میتری نے سُن لی اور امر ہو گئے۔

جُگ ہی بیت گئے۔ کال کے کلنڈے پر بودھ اور میتری کے لئے کُند ہو چکے تھے۔ پربودھ نے کہا۔ "اب تو وقت ہی اور آگیا ہے رانی! مگر تمہیں وہ دن یاد ہے جب آدم کے بیٹے قابیل نے اپنے سگے بھائی ہابیل کو ایک پتھر سے مار ڈالا تھا؟"

"ہاں۔" میتری بولی۔ "ایک بے شکل سی لڑکی کے پیچھے، جو اُنکی اپنی ہی بہن تھی"

پربودھ جھلا اُٹھا۔ "ابھی تک تمہیں معلوم نہیں مرد اور عورت قدرت

کے دو اصول ہیں، اُن میں ذات اور رشتہ کی بات ہی کیا ہے؟"

"ہاں ــــ مگر ــــ"

"مگر کیا ــــ ؟" پربودھ نے میتری سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

"قدرت کیا اِس بات کا حساب رکھتی ہے کہ کس پیڑ کا جوہر، کن ہواؤں سے رس دوسرے پیڑ پر جا گرتا ہے، قدرت کا قانون افزائش نسل ہے، چاہے وہ کیسے ہی ہو کسی سے بھی ہو۔"

اِس وقت پربودھ اُن ہزاروں کبوتریوں کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بے حد حسین تھیں، کیونکہ وہ فانی تھیں۔ اُن کے گلوں کے حلقے راتوں کے پیار سے کالے اور چمکیلے ہو رہے تھے اور انڈے روئی کے گالوں ــــ سے نرم، گورے اور چکنے ــــ پربودھ جیسے خیالوں کے اختلاط سے خود ہی تھک گیا اور بولا۔

"عورت کی وجہ سے ہمیشہ لڑائی ہوتی آئی ہے اور ہوتی رہے گی۔"

"عورت کیوں؟" میتری چمک اُٹھی۔ "زر اور زمین بھی تو ہیں"

پربودھ نے شہوانی نظروں سے میتری کی طرف دیکھا اور بولا۔

"زمین بڑی ہے اور زر اُس سے بڑا۔ پر کبھی تم نے سوچا کہ یہ عورت ہی کے دو روپ ہیں؟"

میتری نے اپنی نازک سی گردن گھمائی اور اپنی سوچ میں گم ہو گئی پھر پیار کی کمندیں پربودھ پر پھینکتی اپنا دایاں پربودھ کے بائیں پر میں پھنساتی

ہوئی بولی۔ "مجھے جھانجریں لادو نا۔ جو ایتھنز کے کھنڈروں میں ابھی تک لوگوں کی نظروں سے اوجھل پڑی ہیں ـــــ پھر میں تمہیں وہ پیار دوں گی کہ ....."

پربودھ نے جھانجروں کے بارے میں سوچنے سے پہلے ہی گھوں گھوں کرتے، پھولتے ہوئے اپنی چونچ میتری کی چونچ میں تالو تک کھبو دی، پھر خود ہی علیحدہ ہوئے بولا۔ "کیا فائدہ اس پیار کا جس میں ہم مر بھی نہ سکیں۔ کسی وقت تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جینا نہیں مرنا اہم ہے۔" اور پھر وہ کہہ اُٹھا۔ "سب اُلٹ پلٹ ہو گیا ہے۔"

میتری بھی جانتی تھی کہ پربودھ اُس وقت تک جھانجریں نہ لاکر دیگا جب تک کہ اُس کی سوچ میں کچھ خود غرضیاں نہ ہوں گی۔

پھر پربودھ بچھڑی صدیوں کی باتیں کرنے لگا اور اُن راسوں کی جو دمیتریاس نے اسکندریہ میں الیفرودیتی کے ساتھ سمندر کے کنارے رچائی تھیں۔ پھر ایڈی پس کی، جس نے نادانی میں اپنی ماں سے شادی کر لی تھی اور جب اُسے پتہ چلا تو صدمے ہی سے چل بسا۔ ویر کُنال کی باتیں جس کی محبوبہ اُس کے باپ کے ساتھ سانجھی ہو گئی تھی۔ اور جس کے کارن کُنال کو اپنی آنکھیں دینی پڑیں ـــ پھر بھرتری ہری کی جس نے حُسن اور جوانی کو دائم و قائم رکھنے والا سیب اپنی رانی کو دیدیا، مگر رانی نے اپنے عاشق ایک دھوبی کے حوالے کر دیا۔ جس نے اُسے اپنی محبوب طوائف کو دے دیا۔ جو ساری دُنیا کا بھلا کرنے کیلئے اُسے وقت کے بادشاہ

کبوتری ہری کے پاس لے آئی ...

پربودھ اور میتری نے ابد سے سب کچھ دیکھا تھا اور اب ازل دیکھنا چاہتے تھے۔ مرد اور عورت کے درمیان یہ لاقانونیت دیکھ کر میتری بولی "آخر کوئی قانون تو ہونا ہی چاہیے!" حالانکہ وہ آپی من مت کے بارے میں سوچ رہی تھی جیت تیجے پنجاب کے میدانوں میں ایک پرانے سے ٹر پر رہتا تھا اور ایک نوجوان لاجوردی گردن والا خوبصورت کبوتر تھا۔ اِس لیے کہ وہ فانی تھا۔ اُس کے بارے میں سوچتے ہوئے میتری کا پورا دن چھنک اُٹھا اور پیٹ میں ایک کسمساہٹ سی دوڑ گئی۔ وہ من مت کی بات کچھ اِس انداز سے کرنے لگی جیسے کوئی بات ہی نہ تھی۔ مگر اُس کا نام سنتے ہی پربودھ پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا اور اُس کے پر پھڑپھڑانے لگے۔ پربودھ کے غصے اور لرزے کو دیکھ کر میتری ڈر بھی رہی تھی اور اندر کے کسی جذبے سے خوش بھی ہو رہی تھی، وہ نظریں چراتی ہوئی بولی۔ "زندگی کی فلاح کے لیے ہم ہی قانون بناتے ہیں۔ کیا خود انہیں توڑ نہیں سکتے؟"

پربودھ جو کچھ دیر پہلے کہہ رہا تھا۔ "قدرت کا قانون افزائشِ نسل ہے، چاہے وہ کیسے بھی ہو، کسی سے بھی ہو" جلدی سے کہہ اُٹھا۔ "نہیں!"

ایک دن کسی لمبی پرواز کے بعد پربودھ اور مَیتری اپنے گھونسلے میں لوٹ آئے۔ من مت اُڑتا ہوا امرناتھ کی گپھا تک پیچھے آیا تھا اور پھر مایوس ہوکر واپس ہولیا۔ مَیتری کو اس بات کی خوشی بھی تھی اور افسوس بھی تھا۔ خوشی اِسلیئے کہ اُس کا پربودھ اُسے اب بھی آسمانوں سے ہمیشہ نازل ہونے والی بلاؤں سے بچا سکتا تھا اور پھر وہ خود بھی اب تک اتنی خوبصورت اور جوان تھی کہ میدانوں کا من مت فرسنگوں اُس کے پیچھے اُڑکر آسکتا تھا اور مایوس ہوکر واپس جاسکتا تھا اور افسوس اِس بات کا کہ پربودھ اُسے کسی وقت بھی ایک آزاد پرواز سے روک سکتا تھا۔

گھونسلے میں پہنچتے ہی پربودھ اور مَیتری کو ایک عجیب سی نرمی اور گرمی، سُکھ اور آرام کا احساس ہوا۔ جب پربودھ نے اپنی مستی بھری آنکھوں سے مَیتری کی طرف دیکھتے ہی اپنے پر اُس پر پھیلا دیے اور کہنے لگا۔

"رانی! ہم نے کتنی دُنیا دیکھی ہے ــــ کتنے جُگ ــــ کتنے دیش ــــ پر اس دھرتی پر ایک ایسا دیش بھی ہے جس کی کوئی مثال نہیں۔"

"پنجاب۔" مَیتری نیچے میدانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ اُٹھی

اور پھر اُس نے ایک آہ سرد بھری۔ جسے پربودھ نے نہ دیکھا۔

"تم نے کیسے بوجھ لیا؟" پربودھ نے ششدر ہو کر پوچھا۔

اُس کی چونچ نے سُرخی پکڑ لی۔

مینتری کہنے لگی۔ "وہی تو ایک دیش ہے جس کی دھرتی سے آٹھوں پہر لوبان کی خوشبو اُٹھتی رہتی ہے۔ جس کا لمس بدن میں صحت کی خارشیں پیدا کرتا ہے۔"

"ہاں!" پربودھ نے حامی بھری۔ "اُس کے پربت آسمانوں کے ہمسائے ہیں اور دھرتی کی ہری اوڑھنی پر ویرانی کے رنگ کا ایک بھی چھینٹا تو نہیں۔ اُس کے دریا تو ایک طرف پوکھر بھی انوراگ سے واقف ہیں۔"

———— "جہاں کے مرد اکھڑ ہیں، عورتیں جھگڑ، وہ خود ہی اپنے قانون بنا لیتے ہیں اور اگلے ہی پل بے بس ہو کر خود ہی اُنہیں توڑ بھی دیتے ہیں۔ اور پھر نئے قانون وضع کرنے کیلئے چل نکلتے ہیں۔ دیوی ماں اُنکے گناہوں کو سرزد ہونے سے پہلے ہی معاف بھی کر دیتی ہے، کیونکہ اُنہوں نے بہت دُکھ دیکھا ہے۔ اُتر پچھم سے اُن پر سینکڑوں حملے ہوئے۔ مگر اُنہوں نے اپنی فولاد سے زیادہ سخت چھاتیوں کو ڈھال بنا لیا۔ اور آلام کی سب ضربیں اُن پہ لے لیں۔ اُنہوں نے اپنی ماؤں اور بہنوں کی عزت دیدی پورے دیش کی ماؤں اور بہنوں

کی عصمت بچانے کے لئے ـــــ وہ کسی وقت بھی سونے کو مٹی میں رول دیتے ہیں اور پھر اُسی مٹی کو کھنگال کر اُس میں سے کندن پیدا کر لیتے ہیں ـــــ عجیب کیمیا گر ہیں وہ ـــ ۔

ـــ "نہ معلوم وہ کس مٹی سے بنے ہیں۔ جمتی ہوئی برفوں اور تپتی ہوئی ریتوں میں وہ بس سکتے ہیں۔ جہاں دُنیا کے لوگ دوسروں ہی کی نکتہ چینی میں لگے رہتے ہیں ـــــ وہاں پنجابی ہی ہے جو اپنے آپ پر بھی ہنس سکتا ہے، وہ اچھا دوست ہے اور بُرا دشمن ـــــ جہاں بھی لوگ تمہیں ایک بلند آواز سے ہنستے، قہقہہ لگاتے ہوئے سُنائی دیں، وہاں ضرور کوئی پنجابی ہوگا۔ کیونکہ وہ دُنیا کا ماتم کرنے نہیں آیا۔ اور نہ فلسفہ رانی اُس کا نصب العین ہے، وہ جو اندر سے ہے، وہی باہر سے ـــــ اُس کے جیون کا رہستیہ ہی یہ ہے کہ کوئی رہستیہ نہیں ۔

"وہ ایک ایسا پودا ہے رانی! جو دُنیا کی کسی بھی دھرتی پہ پنپ سکتا ہے۔ اُس کی دھرتی کی وسعت اُس کی نگاہ اور دل میں سمائی ہے۔ اور ہواؤں کی مستی دماغ میں!

"رانی! پنجاب اور پنجابی کبھی ناش نہیں ہو سکتے۔ نہ معلوم اُنہوں نے کونسی امرکتھا سُنی ہے۔ جس میں وہ اونگھ بھی گئے اور یا بھی گئے پی بھی گئے اور چھلکا بھی گئے۔ زندگی کے رونے دھونے سے اُن کی تپسیا

پوری نہیں ہوتی۔ ہاں ہنسنے کھیلنے، کھانے اور پہننے میں ہی اُن کا موکش ہے ——"

راجندر سنگھ بیدی

۵ر فروری ۱۹۶۴ء

(۱)

آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی۔ آج آسمان کے کوٹلہ میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اُس کے خون کے چھینٹے پنجے بکائن پر پڑتے ہوئے تلو کے کے صحن میں ٹپک رہے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے، ڈبّو منہ اُٹھا اُٹھا کر رو رہا تھا۔

دوپہر کے قریب بڑی ذیل کے کارندے جب کتّوں کو گولی ڈالنے کے لئے آئے تو ڈبّو بچ گیا۔ وہ تلو کے کے ہاں کہیں صحن میں پڑی گھڑونچی کے نیچے سو رہا تھا؛ اوپر ملتانی مٹّی کے گھڑے رِس رہے تھے اور نیچے کچی زمین

کو ٹھنڈا اور خوشبودار بنا رہے تھے؛ اور ڈبو اس ٹھنڈک، اور بو باس سے پورا فائدہ اُٹھا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ اُٹھ کر اکڑا، مُنہ کھول کر جمائی لی اور پھر باہر چلا آیا۔ جب تک اُس کی جیٹھی کُتیا بوڑی کی آنکھیں کانچ ہو چکی تھیں۔ بوڑی کے پاس پہنچ کر ڈبو نے اُسے ایک دو بار سونگھا اور پھر اچانک ایک سمت چل دیا، جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ تلوکے کی بیوی، رانو اور اُس کی پڑوسن چنّوں، ایک دوسری کا مُنہ تکنے لگیں۔ چنّوں نے اپنی کوکے والی ناک پر اُنگلی دھری، پھر ایک لمبی سانس بھری اور بولی۔

"ہا! مرد کی جات۔ سب ایک ہی سی ہوتی ہے۔"

رانو کی غلافی آنکھیں پھڑپھڑا رہی تھیں، جیسے کوئی کپڑے کو دھو بنا کر چھانٹ رہا ہو۔ پھر کچھ سنبھلے مگر آنکھیں پونچھتے ہوئے، رانو نے چنّوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"اَینٹے! تیرا ڈبو تو ایسا نہیں!"

اِس پر چنّوں نے رانو کو مردوں والی گالی دی، جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی۔ رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا لگی۔ شام کے وقت جب وہ رات کی آہ اور دن کی واہ کا کوڑا پھینکنے کے لئے باہر آئی تو دوپہر کے سارے واقعات

بھول چکی تھی۔ جس ہاتھ سے اُس نے کوڑا اچھینکا اُسی سے جھاڑ وچھانٹے ہوئے وہ منہ اُٹھا اُٹھا کر رونے والے ڈبّو کو بھگانے لگی ــــــ

"ہات، ہات مُردے! یہاں دھرا ہی کیا ہے تیرے رونے کو؟ رونا ہی ہے تو جا سامنے چودھریوں کے گھر جا کر رو، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں۔ مردوں کی لام لگی ہے۔"

چودھری مہربان داس سے رانو کو خدا واسطے کا بیر تھا۔ شاید اس لیے کہ تلوکے، رانی کے گھر والے کو بدمعاشی کی لت مہربان داس کے ہاتھوں لگی تھی۔ پھر گاؤں کی عورتوں کی عجیب بات۔ اپنے مرد کا کچھ پتہ نہیں، دوسریوں کے مردوں کا کھایا پیا سب معلوم۔ رانو اپنے تلوکے کے بارے میں، جب نواب اِکّے والے یا گوردا س کی بیوی سے سُنتی تو جل بھُن کر راکھ ہو جاتی۔ شاید راکھ نہیں، کوئلہ! کیوں کہ اندر سے رانو بہت پکی تھی۔ تلو کا گھر لوٹتا تو وہ اُس سے لڑتی، اُسے نوچتی، کاٹتی اور پھر خود ہی مار کھاتی ہوئی ایک طرف جا بیٹھتی اور سوچتی: ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو باہر ہی غصہ نکال آتا ہے اپنا۔ میرے جی کا جنجال تو نہیں ہوتا۔"

اِن، صرف اِن باتوں سے رانو کو تلوکے کے مرد ہونے کا پتہ چلتا اور وہ ایک ضد کے ساتھ اُسے اپنا بنانے کی کوششوں میں

لگ جاتی۔ کوششیں کیا؟ لُنڈے پیپل کے نیچے ایک سائیں بابا تھا۔ جتی ستی! جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اُس نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا ہے اور اب تک نہیں جانتا کہ عورت کیا چیز ہے؟ حالانکہ چوبیس گھنٹے، آٹھوں پہر اُس کے گرد عورتوں ہی کا جمگھٹا رہتا۔ کوئی بیٹا مانگتی، کوئی اٹھرا کی دوائی۔ اکثر تو اپنے مردوں کو بس میں کرنے کے ٹوٹکے ہی پوچھنے آتیں۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے اُس نے پورن دئی مصرانی کو ٹوٹکا دیا جس سے نہ صرف وہ پیٹ والی ہوگئی بلکہ گیان چند اُس کا مرد، پاگلوں کی طرح اس کے اردگرد چکر کاٹنے لگا۔ رانو بھی تلوکے کی مار سے بچنے کیلئے باواہری داس سے ایک ٹونا لے آئی اور اِس تاک میں لگ گئی کہ کب تلوکا کچا دودھ مانگے اور وہ ٹونے کو اس میں گھول کر پلا دے اور پھر پاس نہ آنے دے۔ ہاں، جب منتیں کرے، پاؤں پڑے، ناگ رگڑے ——— تب! لیکن تلوکے نے ہفتوں کچا دودھ مانگا نہ پیا۔

تلوکا، روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز میٹھے مالٹے کی ایک بوتل چوہدری مہربان داس کے ہاں سے لے آتا تھا۔ رانو دُنیا بھر کے عیبوں کو معاف کر سکتی تھی، لیکن شراب کو نہیں۔ وہ سمجھتی تھی، شراب ایسی سوت نہیں دُنیا میں مرد چاہے اپنا سب کچھ کسی دوسری پر لُٹا آئے پھر بھی اُس کا کچھ نہ کچھ تو اپنے لئے بچ ہی رہتا ہے۔ لیکن شراب؟ ماں ری

ہاں! اُس سے تو اتنی بُو آتی ہے کہ انسان منہ بھی پاس نہیں کر سکتا۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا سب ہی کچھ لُٹ گیا۔ تلو کا دن بھر نواب، اسمٰعیل، گوردا س وغیرہ کے ساتھ اِکا ہانکتا لیکن شام کے وقت نصیبوں والے اڈے پر جا کر اِس تاک میں کھڑا ہو جاتا کہ کوئی بھولی بھٹکی سواری مل جائے اور وہ اُسے اچھے کھانے، نرم اور گرم بستر کے لالچ میں لے جا کر مہربان داس کی دھرم شالہ میں چھوڑ دے۔ دراصل تلو کا یہ سب مہربان اور اُس کے بھائی گھنشیام ہی کے لئے کرتا تھا، لیکن اِس پر بھی بدنامی اُس کی اپنی ہوتی تھی۔ اُس کے حصہ میں آتی بھی تھی تو ایک آدھ چانپ اور مٹھے ملائے کی بوتل!

کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی۔ چوہدری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیروں کے جنگل سے بچتی بچاتی اِس گاؤں میں آنکلی تھی اور اُس جگہ، جہاں اب ایک مندر کھڑا تھا، گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیالکوٹ، جموں وغیرہ کی پہاڑیوں میں گم ہو گئی تھی۔ اب بھی کسی دھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور اُفق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے۔ وہی وشنو دیوی کا پہاڑ ہے۔

تلو کے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چوہدری کی دھرم شالہ میں چھوڑا، وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہو گی ——— دیوی کے پاس

تو اپنے آپ کو بچانے کیلئے ترشول تھا، جس سے اُس نے بھیروں کا سر کاٹ کر الگ کر دیا تھا لیکن اِس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی سے ہاتھ تھے جنہیں وہ بھیروں کے سامنے جوڑ سکتی تھی، اُن سے مدافعت نہ کر سکتی تھی ــــ پھر بدن ــــ جیسے تربوز کے گودے کا بنا ہوا تھا، جو مہربان کی چھُری سے بچ نہ سکتا تھا۔ شاید اسی لئے اُس دن کا سورج غصّے میں لال اپنے رتھ کے گھوڑوں کو اِدھر چھانٹا، اُدھر چابک، اُدھر چھانٹا، اِدھر چابک لگاتا ہوا سامنے خانقاہ والے کنوئیں کے پاس، فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہو گیا تھا اور اوپر آسمان پر دوج کے نازک سے چاند کو بچھڑنے، پیلا ہونے کے لئے چھوڑ گیا۔

دھرم شالہ کے پاس ٹھیکے والوں کے مکان کی نئی ٹیپ ہوئی تھی۔ سپاہیوں کے پرے دیواروں کے چہرے پہ چھپٹے چپکے تھے۔ اینٹوں کا گیروا رنگ تو دکھائی نہ دیتا تھا، البتہ اُن کے بیچ کا چونا، اتنے اندھیرے کے باوجود سامنے ہنستا، منہ چڑاتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پُروائیں کوٹلے کے سارے بھروانہ، جامن اور بڑائن سنسنا رہے تھے اور جوہڑ کے کنارے باوا ہری داس والے ٹنڈے پیپل کے گنے چُنے پتے ایک بے ہنگم سی آواز پر

تال دے رہے تھے جس راستے پر تلوکا جا رہا تھا، وہ گاؤں کے ایک ہی بازار اور بازار میں ایک ہی آٹے دانے کی دوکان کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا۔ جہاں اتفاق کی بات، ایک ہی عورت، جہلم ارائین اپنی ترکاری دے کر اُس کے بدلے گیہوں لے رہی تھی۔ اُس کے پاس سے گزرتے ہوئے تلوکے نے آواز دی:

"کیوں جہلمیں! پھر کیا مرضی ہے؟"

گاؤں بھر میں ایسے آوازوں کی عادی، غریب کی جورو سب کی بھابھی، جہلم نے تلوکے کی طرف مُڑ کے بھی نہ دیکھا اور جھولی اناج سے بھرتی ہوئی بولی:

"جو تیری ماں کی ہے، تلوکا! ہائے تجھے پیدا ہونے سے کسی نے نہ روکا؟"

—— اور تلوکا ہنستا ہوا نکل گیا۔

گھر پہنچا تو اُس کے جڑواں بیٹے ابھی تک بکائن کے تلے کوئلے سے لکیریں ڈالے آپس میں بارہ گٹال کھیل رہے تھے۔ ایک نے غلط ہی دوسرے کی کنکری مار لی اور مہا بھارت شروع ہو گئی۔ وہ بنا سوچے سمجھے بڑوں کی ٹھیٹھ زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے، بال نوچنے لگے۔ باپ کی آہٹ پاتے ہی وہ اپنے اپنے اُردو کے

قاعدے لئے دیئے کی روشنی میں بیٹھ گئے۔ ادھر باپ نے آواز دی۔
"پڑھو، اوئے، پڑھو....." اِدھر بچے نے پڑھنا شروع کیا۔ "وہ دیکھو اُتو بولا......" تلو کے نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا۔ "میں سب جانتا ہوں، حرامیو!" جس پر چھوٹا زور زور سے کہنے لگا۔ بک بک مت کر، بک بک مت کر۔" اور تلو کا اِس نئی تعلیم کو ایک ناقابل علاج بیماری سمجھ کر سٹک گیا۔

اِن جبڑواں بچوں، بنتے اور سنتے سے بڑی پہلونٹی کی ایک لڑکی تھی، جس کا نام تلو کے اور رانو نے ہمیشہ کی سہولت کے لئے "بڑی" ہی رکھدیا تھا۔ وہ دن بھر کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور جب کچھ نہ ہوتا تو سب سے چھوٹے سال بھر کے جمّوں کو کھلانے لگتی:

"ویر آیا کھیل کے، میں من پکا دالی ویل کے"

وہ محلّہ کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گیند بھی کھیلتی، جب بھی وہی بھیّا اور وہی

بھابھی:

کوٹھے اُتے کنا، ویر میرا لماں
بھابو میری پتلی، جہدے نک مچھلی

اور ایسی ہی آس پاس کی چیزیں: گنا، ویر، بھابی، ناک کی مچھلی، ٹنڈا پیپل، توریاں، جیٹھ ــــ اُس کی کائنات ابھی جیٹھ کے تصور تک ہی پھیلی تھی لیکن ابھی سب کچھ جھل مہل ہی تھا۔ البتہ گھر میں ایک اور تھا، جو تیزی سے سمجھدار ہو رہا تھا، ٹری کا چاچا، تلوکے کا چھوٹا بھائی، رانو کا دیور، منگل ــــ بے کار اور بیکار، دن بھر اِسے چھیڑ، اُسے چھیڑ، بار بار اپنے تہبند کو کس، گھر آتا تو یوں کھانا مانگتا، جیسے سب اُسی کی کمائی کا ہو اور بھابھی رانی اندر سے خوش، باہر سے غصے میں کہتی:

"دیتی ہوں مُشٹنڈے، تیرے ہی لئے تو سب پکا ہے"

منگل پانچ چھ برس کا بچہ تھا جب تلوکا، رانو کو بیاہ کے اُس کے مائیکے سے لایا۔ رانی کے ماں باپ بے حد مفلس تھے، شاید اسی لئے انہوں نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ دیا تھا۔ جب وہ بڑی ہوئی، بھری تو روٹی کپڑے کے وعدے پر اُس کے ماں باپ نے اُسکا ہاتھ تلوکے کے ہاتھ میں دیدیا اور خود عدم آباد کی طرف نکل گئے۔ رانو کو اِس بات کا بڑا دُکھ تھا کہ اُس کا آگا تو جیسا تیسا بھی ہے لیکن پیچھا کوئی

نہیں۔ کبھی تو ایسا وقت آجاتا ہے جب ہر عورت گر کر پیچھے دیکھتی ہے اور جو نہ دیکھ سکے تو اُسے آگے بھی نہیں نظر آتا۔ رانی جب سے کوٹلہ میں آئی تھی تو اُسے ماں کے روپ میں ساس جنداں مل گئی تھی اور باپ کی شکل میں سسر حضور سنگھ، اور دیور منگل، جو اتنا چھوٹا تھا کہ بڑی کے پیدا ہونے پر اس کے ساتھ دودھ پینے کیلئے مچل گیا۔ کچھ ہنستی اور کچھ شرماتی ہوئی رانو نے اکیلے میں جب اسے پاس بٹھا کر کرتے میں سے چھاتی نکال کر اُسکی طرف بڑھائی تو وہ بھاگ نکلا ——— منگل کو رانی ہی نے پالا۔ دُنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا لیکن رانی کی نگاہوں میں اس کا بڑا بچہ۔ منگل بھی رانی کو اپنی ماں ہی سمجھتا تھا، ورنہ وہ سگی ماں کو "تائی" کیوں کہتا؟ جبھی تو رانی اس کے کان بھی امیٹھ لیتی تھی، دھول دھپہ بھی کرلیتی۔ لیکن اب پچھلے چند برسوں سے دُنیا ہی بدل گئی تھی۔ نہ صرف بچے بڑے ہو گئے۔ بلکہ منگل بھی آنکھیں دکھانے لگا اور تلوکا شراب پینے اور جنداں روایتی ساس کی شکل اختیار کرتے ہوئے بات بات پر کاٹنے لگی۔ اس کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے تھے۔ اِدھر تلوکا ہفتہ میں دو تین دن گھر میں ہی پڑا رہتا، اُدھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اُتر آیا تھا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اُس کی آنکھوں کے پپوٹے صبح جوہڑ میں نہانے والے کبوتروں کی

طرح پھڑپھڑاتے رہتے۔

چھٹی کے دن ایک روز شام کے وقت تلوکے نے رانو کے پاس جاکر اپنے اریب کے کرتے کی جیب میں سے ایک ٹماٹر نکالا اور اُسے رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

"لے ایک پیاز ڈال کے کاٹ دے اِسے"

رانی جو ترکاری پکا رہی تھی، تھم گئی۔ ہاتھ کی کڑچھی دیگچی میں ڈالتے ہوئے وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی ــــــ

"پھر لے آئے میری سوت کو؟"

تلوکے نے جھینپتے ہوئے کہا ــــــ

"روز تھوڑا ہی ہوتا ہے رانو؟"

"روز ہو یا نہ ہو" رانی کڑک کر بولی ــ "میں نہ پینے دونگی۔ کہاں ہے تمہاری بوتل؟ آج میں دیکھ تو لوں، اِس میں کیا ہے، جو مجھ میں نہیں؟"

تلوکا اِس بات سے ڈر رہا تھا کہ شور نہ مچے، لیکن رانو نے وہی بات کی۔ دانت پیستے اور جھلاتے ہوئے تلوکے نے ایک نامردانہ سی کوشش کی ــــــ

"کُتیئے! کنجرئے! میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کر رہا ہوں اور تو ہے

کہ چھو مٹتے ہی ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئی؟"

"ہاں!" رانی بولی ـــ "بے شک، گھوڑے گھوڑیوں پر تو ہی سوار ہو سکتا ہے، کوئی دوسرا نہیں؟ آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے رہونگی. آج اس گھر میں یہ رہے گی، یا میں رہوں گی ـ"

اور رانو بوتل ڈھونڈ ھنے دوڑی ـ آناً فاناً تلو کے کی آنکھ کا پانی مر گیا۔ اُس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اُس کے اُڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اُس کا بیڑا کر دیا۔ دیے کی لَو ایک بار بجھنے کے قریب ہوئی اور پھر سیدھی ہو کر کانپنے لگی۔ بکائن پر بیٹھے ہوئے تلیئر اُڑ گئے۔ ڈبو تن کے کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھونکنے لگا۔ بڑی چلائی۔ "باپو!" بچے اندھیرا ڈھونڈھنے اور چھپنے لگے۔ ایک تو موقع پا کر گھر سے بھاگ گیا۔ دوسرا ایک کونے میں جا لگا۔ دہشت کے عالم میں کانپتا ہوا، وہ ماں کی بجائے "آں آں!" کہہ رہا تھا۔ حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا، فریاد کے انداز میں گالیاں دیتا ہوا ـــــــــــ

"اوئے پاپیا! اوئے بے شرما! اوئے بے حیاوا!"

اور تنور پر گر کر جھلس گیا۔

پہلے ہلے میں رانی برابر آئی۔ اُس نے اپنی بتیسی تلو کے کے

ہاتھ میں گاڑ دی۔ تلوکے نے اور غضب ناک ہو کر اُسے بار بار دیوار کے ساتھ مارا اور وہ گالیاں دیں، جو اُس نے کبھی اپنے جانور کو نہ دی ہوں گی۔

"مار ڈالا۔ ماں کو مار ڈالا۔" بڑی چلّا رہی تھی، اور جب دادی باہر سے آئی تو بڑی کی شلوار گیلی ہو چکی تھی۔

حنداں آتے ہی بولی۔ "جانتی تھی..... میں جانتی تھی، ایک دن یہ چاند چڑھنے والا ہے ..... ہائے، یہ پٹڑی واسوں (خانہ بدوشوں) کی اولاد! جانے ہمارے گھر میں کہاں سے آگئی؟"

"تو بیچ میں مت بول" ——— منگل ماں سے کہہ اُٹھا۔

وہ میاں بیوی کی لڑائی میں کسی کا بھی آنا ٹھیک نہ سمجھتا تھا اور ایک طرف کھڑا اپنے آپ کو روکنے اور سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"کیوں نہ بولوں؟" بُڑھیا بکے جا رہی تھی۔ "اپنی کمائی کی پیتا ہے، اُس کے باپ کمینے سے تو مانگنے نہیں جاتا؟ خود تو کھپ گیا۔ گلہنج (چیل) چھوڑ گیا ہمارے لئے"

ماں کی شہ پا کر تلوکا اور بھی تند ہو گیا۔ اُس نے رانی کے کپڑے پھاڑ دئے اور اسے یوں کر دیا، جیسے ابھی پیدا ہوئی ہو۔ وہ زور زور سے چلّا رہا تھا۔ "نکل جا! نکل جا میرے گھر سے"

رانی بے دم سی ہو کر کہے جا رہی تھی ۔

"میں نہیں رہوں گی ، میں آپ نہیں رہوں گی"..... کچی دیوار کے پاس کچھ اجنبی سے چہرے اُٹھے ، اوپر کوٹھے پر کچھ عورتوں کے سلیے رینگے ۔ "مار ڈالا ، ارے یو مار ڈالا ـــ ہائے نی کوئی بچاؤ ـــــ ہائے نی یہ راکھش....."

ایسی ہی آوازیں آ رہی تھیں ۔ سبھی اوپر کلیجہ تھامے کھڑی تھیں نیچے آنے ، رانو کو چھڑانے کی ہمت کسی کو نہ پڑتی تھی ۔ جب ہی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی جہلم اراعین ، اُس کی بیٹیاں ، پورن دئی برہمنی ، نواب کی بیوی عائشہ ، چنوں ، ودیا ، سردیو ـــ سب ہی پہنچ گئیں ، لیکن اُن سب میں صرف چنوں چلّا رہی تھی ـــــ

"چھڑاؤ وے ، وے کوئی چھڑاؤ"......

"خبردار جو کسی نے چھڑایا" رانو اوپر دیکھتے ہوئے چلّائی ـــ "تم سب جاؤ .... جاؤ تم ...... کیا تم کو نہیں پڑتیں ؟" اور پھر بولی ۔ "آج جو ہونا ہے ، ہو جاتے دو ایک بار ۔ آج دیوی کے کوٹلے میں بڑا پن ہو گا ۔ آج میں اس کے ہاتھوں مروں گی ، سورگ کو جاؤں گی ۔ آج میرے بچے مجھے روئیں گے ۔"

ـــــ رانو عورتوں کو بھگا رہی تھی ، بُلا بھی رہی تھی ۔

کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رہا تھا اور کہاں اب ایکا ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا، اور موٹی سی ماں کی ایک گالی دیتے ہوئے بولا۔

"لا ——— اب لا ہاتھ نیچے، کہ ایک عورت ہی پر ختم ہو گئی سے زوری؟ ہل، ہل اب، اپنے باپ کا ہے تو؟"

تلوکے نے منگل کی آہنی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی وہ کچھ بولنے، بکنے لگا لیکن منگل کی نگاہوں میں قتل دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ منگل نے اسی پر بس کی، آگے بڑھ کر اس نے زور سے بوتل کو ٹھوکر ماری اور وہ ٹوٹ گئی۔ شراب کی بو پھیلی اور منڈیر پر کھڑی عورتیں چھی چھی کرتی، ناک پر کپڑا رکھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ دیر کے بعد چلی گئیں ———

پھر تلوکے کو یوں ٹھس ہوتے دیکھ کر منگل نے خود ہی اسے چھوڑ دیا اور وہ تلوکا۔ بکتا جھکتا ہوا اندر کی طرف چل دیا۔ اب اس کی گالیوں میں تیہر نہیں بنو لے تھے جو ہولے ہولے دماغوں پر لگ رہے تھے۔ ان میں پہلی پہلی سی بے تکلفی نہ تھی۔ اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں کسی کتاب سے کچھ پڑھ کر سنا رہا ہے۔

رانو اندر جا کر ایک ٹرنک میں کپڑے ڈالنے لگی وہ جا رہی تھی کہاں جا رہی تھی؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا، وہ بس جا رہی تھی ——— "بیٹی تو کسی

دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان! ذرا بڑی ہوئی، ماں باپ نے سسرال دھکیل دیا۔ سسرال والے ناراض ہوئے، مائیکے لڑھکا دیا —— ہائے! یہ کپڑے کی گیند! جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی۔"

کپڑے تھے ہی کتنے! پل بھر میں ٹرنک تیار ہو گئی اور پھر رانو ایک دم کوٹھڑی سے باہر نکل آئی جو در دتی، دوسروں کو رلاتی ہوئی بولی:

"لو جی سنبھالو اپنا گھر —— یہاں میں ہی مہمان تھی ناں، سوچا رہی ہوں۔ تم لے آنا کسی اور کو جو کرے مرے بھی اور تمہاری گالیاں بھی سنے، مار بھی کھائے اور ہڈیاں بھی تڑوائے۔"

پھر رانو کو سامنے بچے نظر آ گئے، غم اور غصے میں اندھی ہو کر جنہیں وہ بھول ہی چکی تھی —— "بچے؟" وہ خود ہی بول اٹھی "میں سمجھوں گی پیدا ہی نہیں ہوئے۔ سمجھوں گی مر گئے!"

بڑی نے پاس آ کر دوپٹے کا پلو تھامتے ہوئے کہا:

"ماں"

رانو نے ایک دم جھٹکے سے پلو کو چھڑا لیا اور بولی ——

پرے ہٹ مُردیے! ایک دن تیرا بھی یہی حال ہوگا..."

اور وہ باہر کی بہت ہی وسیع و عریض دُنیا کی طرف چل دی۔ اندھیرے کے کارن آسمان کے تاروں کے سوا اُسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُدھر ایک ایک ستارہ اپنی زمین جتنا بڑا تھا اور کئی زمین سے بھی بڑے جو سامنے کھڑے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ بیچ میں کالی بدلی آجانے کی وجہ سے دوج کا چاند دو پھانک ہو چکا تھا۔

منگل نے بھاگتے ہوئے رانو کا بازو تھام لیا، اور بولا:

"بھابھی! کہاں جائے گی؟" اور پھر دہشت کے عالم میں پیچھے ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ———

"اِسے روکو تائی"

جنداں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی:

"جائے گی کہاں ہ؟ آ گا نہ پیچھا..."

حضور سنگھ چلایا:

"ڈھیٹے! رانیٹے!"۔

اور پھر انداز سے ہی سے اُس کی طرف لپکتے ہوئے پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کُرتا اُٹھا لیا اور وہ چھالے جو تنور پر گر کر جُھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے، دکھاتے ہوئے بولا:

"میرا پنڈا تو دیکھ بیٹا..."

رانو اُبل پڑی منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی:

"باپو!"

جب تک تلوکے کے نشے کا بھی نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ ایک یتیم، لاوارث کی طرح وہ دروازے میں آ کر کھڑا ہو گیا اور اُکھڑی سی آواز میں بولا:

"جا..... جانہ ..... دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟"

"کہیں بھی جاؤں، تجھے اس سے کیا؟" ——— رانی روتے ہوئے بولی ——— "جہاں بھی جاؤں گی، محنت مجوری کر لوگی، اپنا پیٹ بھر لوں گی۔ دو روٹیوں کے لئے مہنگی نہیں کسی کو ——— گاؤں بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لئے، دھرمشالہ تو ہے..."

دُھرم شالہ؟... تلو کا چونک اُٹھا۔ ایک دم آگے بڑھتے

ہوئے اُس نے رانی کی ٹرنکی پکڑلی اور بولا :

"چل ـــــ مر پیچھے "

"پیچھے ؟ - آگے ؟" ـــــ رانو، خوددار رانو بہت کچھ چھینی جھپٹی، لیکن تلو سے کی طرح اب اس کی باتوں میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا۔ وہ کوئی بہانہ ہی چاہتی تھی، جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی۔ اور اب جانے کا فائدہ بھی کیا تھا ؟ بوتل تو ٹوٹ ہی چکی تھی ...

(۲)

منصور سنگھ کے جلتے ہوئے بدن پر رال لگا کر رانو لوٹ آئی۔ تلوکا ٹانگیں پھیلائے پڑا کچھ سوچ رہا تھا۔ سونے سے پہلے ننّھا ایک بار رویا لیکن ماں کے چھاتی منہ میں دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ تلوکے کے دماغ میں آج کے ہنگامے کے بجائے وہ جاترن گھسی ہوئی تھی اور رات بھر گھسی رہی۔ اندھیرے میں وہ خود مہربان داس تھا اور رانو جاترن۔ تلوکے نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رانو نے جھٹک دیا۔

"ہی، بچی! بالکل بچی!" تلوکے نے کچھ کھسیانہ ہو کر کہا ——— "تو تو بالکل ایک بارہ تیرہ برس کی بچی کی طرح سے کرتی ہے۔

ویسے ہی دولتی جھاڑنے لگتی ہے۔"

پھر تلو کا منّت سماجت پر اُتر آیا ——— وہ بھی اُن مردوں میں سے تھا' اندھیرا ہوتے ہی جن کی ساڑی اکڑ جاتی رہتی ہے۔ پھر اُس نے اُٹھ کر شیو جی کی تصویر نکالی جس میں وہ پاروتی کو پاس بٹھائے ہوئے تھے اور سر کی جٹاؤں میں سے گنگا بہہ رہی تھی۔ رانو کے پاس تصویر رکھ کر تلو کے نے شیوؤں کا واسطہ دیا' پاروتی کے امر پیار کی باتیں کیں لیکن رانو اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ پھر اُس نے رادھے کرشن کی تصویر چوکھٹے میں سے نکال لی۔ وہ چوکھٹے سمیت بھی لا سکتا تھا' لیکن وہ ہر تصویر کو چوکھٹے میں سے نکالے دے رہا تھا' جیسے وہ پیے ہوئے ہو' یا ایسے ہی اُس کے دماغ میں کوئی فاسد مادہ اڑ گیا ہو ——— کچھ دیر بعد چوکھٹے ہی چوکھٹے رہ گئے۔ تصویریں بیچ سے غائب ہو گئیں...

رانو صبح اُٹھی تو اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا۔ وہ اُٹھنا نہ چاہتی تھی لیکن گھر کا سارا کام کاج پڑا تھا۔ شام کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا' اِس لئے روٹی کی بھی جلدی تھی۔ پھر گھوڑے کے لئے دانہ بھگونا' اُس کا ساز نکالنا تھا۔ تلو کا ہمیشہ کی طرح ادھ مُوا پڑا تھا۔ آنکھیں بھی آدھی کھلی آدھی بند' منہ پورا کھُلا ہوا۔ رانو اس کے پاس سے اُٹھ کر

دیے کے پاس گئی اور اُسے ہاتھ میں لئے پھر تلوکے کے پاس چلی آئی ـــــ
اُسی جذبے سے جس سے انسان مرے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے لئے
لوٹ آتا ہے...

جب تلوکا اُٹھا تو رانو گھر کا آدھا کام کر چکی تھی۔ اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل شام کچھ ہوا ہی نہیں۔ اُس کے ہاتھوں سے ساز لیتے ہوئے تلوکے کے ماتھے پر پھر سے تیوری چڑھ گئی۔ اُسے دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ رات اُس نے معافیاں مانگی تھیں، نہ کان پکڑے تھے اور نہ ناک سے لکیریں کھینچی تھیں۔ یوں بھی سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی اُس کی مردانہ اکڑ لوٹ آئی تھی۔ ساز کے تھامتے ہی اُس کے گھنگھرو چھن چھن کر اُٹھے۔ گھوڑی کی پروں والی کلغی میں ہوا کی ایک لہر دوڑ گئی اور تلوکا بولا۔

"یہ نہ سمجھنا، میں تجھ سے ڈر گیا ہوں۔"

"میں کب کہتی ہوں؟" رانو نے ٹالتے ہوئے کہا۔

تلوکا اِس پر بھی چُپ نہ ہوا۔ بولا ـــــ

"عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں۔ آج پھر لاؤں گا مٹھے مالٹے کی بوتل، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے؟"

رانی کچھ نہ بولی۔ البتہ دل ہی دل میں اُس نے سوچا:

"آج یہ لایا میٹھے مالٹے کی بوتل تو میں گلے کی ہولدلی چبا لونگی۔ بارہ سنگھے کا پورا سینگ پیٹ میں گھونپ لوں گی؟ کُتے کی گولی کھا مرونگی' جو اُس دن بوڑی نے کھائی تھی۔ پھر یہ کمینہ بھی ڈبو کی طرح ایک نظر مجھے دیکھ کے چھوڑ دے گا؟ ایک آدھ دھاڑ تو مارے گا ہی۔ میرے لئے نہیں تو اپنے بچوں کی خاطر۔ نہیں نہیں۔ کسی کا کیا جائے گا؟ مرجائیگی ماں باپ کی بیٹی۔ پر ماں باپ کہاں ہیں؟ آگا نہ پیچھا! میں نہیں مروں گی۔ ساس خوش ہوگی' کہے گی۔ 'سستے ہی میں جان چھوٹی'۔

جب ہی منگل اپنے البیلے پن میں پاس سے گزر گیا۔ بھائی کے پاس پہنچا تو دونوں مغائرت کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھنے، غرّانے لگے۔

"تیار ہوگیا ہے پٹھا ——— !" تلوکے نے کہا اور خود ہی دُم دبا کر اندر بھاگ گیا۔

منگل نے کوئی جواب دیا اور باہر نکل گیا۔ بڑی ماں باپ کو ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھ کر صحن کی طرف سٹک گئی۔ اور چھوٹے بھائیوں کو مدد سے کے لئے تیار کرنے لگی۔ دوسری کوٹھڑی میں رات بھر کراہتا، جاگتا ہوا حضور سنگھ کہیں پچھلے پہر سو گیا تھا۔

جنداں دبی زبان میں جپ جی کا پاٹھ کر رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد اکا سواریوں سمیت گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور رانو ہمیشہ کی طرح چار موٹی موٹی روٹیاں ایک میلے روغن میں لسے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر تلو کے کو دے رہی تھی۔

رانو نے ایک نظر اکے کی طرف دیکھا، جہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اور چودھری مہربان داس کے کانے اُسے تھامے ہوئے تھے۔ لے جا رہے تھے۔ رانو نے حیرانی سے پوچھا۔

"کون ہے؟ کیا ہوا ہے اِسے؟"

"مرگی!" تلو کے نے جواب دیا۔ وہ گھوڑے کی پیٹھی کا تکس لگا رہا تھا۔

رانو نے ناک پر اُنگلی رکھتے ہوئے کہا ——

"مرگی؟"

"ہاں ——" تلو کا بولا۔ "مرگی —— جو ہر عورت کو پڑتی ہے۔ رات تجھے بھی تو پڑی تھی، اور جس کا علاج جوتا ہے ——" اور پھر اندر طاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یاد وہ چھانٹا جو میں آج میں لوٹ کر تجھ پہ توڑوں گا۔ کل ہی

ننھو نے اس پر شام چڑھائی ہے۔"

رانو کی ٹانگیں کانپنے لگیں، تلوکے کے جانے اور نظروں سے غائب ہوتے ہی اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ چھانٹے کو طاق پر سے اُٹھا کر، اندر بھنڈارے میں لے گئی اور اُسے کھیڑوں میں، گیہوں کے نیچے ـــــ بہت نیچے کر کے چھپا دیا۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ہو پائی تھی کہ سامنے شاملات کی طرف سے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے آئے جن میں نواب اور اسمٰعیل اِکّے والے بھی تھے۔ گیان چند، پورن دئی کے شوہر، اور دیو انا چکّی کے مالک کے پاس پہنچتے ہوئے نواب نے کہا۔

"اوئے پنڈتا، سُنا تو نے؟"

اور پھر اپنا منہ پنڈت کے کان کے پاس کر کے کچھ کہا اِس کے بعد سب مل کر چہ میگوئیاں کرنے اور تلوکے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے۔

جب ہی جہلم کا داماد مُرادبخش، دوکان پر سے ایک ہاتھ میں ترازو، اور دوسرے ہاتھ میں دوسیری لئے ہوئے آیا اور شاہی جاٹ کو خانقاہ والے کنویں پر جانے سے روکنے لگا۔ پھر اُس نے شاہی کے قریب ہوتے ہوئے کچھ کہا اور وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر تلو کے گھر کی طرف دیکھنے لگے۔ رانو دروازے میں کھڑی ان سب کے دیکھتے کو دیکھنے لگی۔

چنوں، جو رانو سے رات کی صلح کے بارے میں پوچھنے آئی تھی اُسے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"بتا، بتا پھر کیا ہوا؟"

رانو نے اُس کی توجہ سامنے ہونے والی سرگوشیوں کی طرف دلائی اور بولی ــــــــ

"ہائے نی! آج اِن مردوں کو ہوا کیا ہے؟ سب کے سب اِسی طرف دیکھ رہے ہیں؟"

"ہاں" ــــــــ چنوں نے دیکھتے ہوئے کہا۔

"جانتی ہے کیوں؟"

"کیوں؟"

"رات مار کھا کے، ہڈیاں تُڑوا کے تو اور بھی

نکھر گئی نا!"

"رنڈ یے ——— کھسم کھا نیٹے!" رانی نے چنّوں کو چوٹی سے پکڑتے، کھینچتے ہوئے کہا اور پھر دونوں ایک دوسری کے کولھوں پر چپیّے دیتے کلکاریاں مارنے لگیں۔

راتو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اُس نے چودھری مہربان داس اور اُس کے بھائی گھنشیام کو ہتھکڑیاں لگے بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ساتھ اٹھارہ اُنتیس برس کا ایک نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے کپڑے خون سے تر بتر تھے۔ اُس کے منہ، سر۔ ہر جگہ پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ ہوش، کچھ بے ہوشی کے عالم میں، حوالدار جہان خاں اور نمبردار تارا سنگھ کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ مہربان داس کا رنگ ایک دم سیاہ ہو جاتے سے، اُس کے کانوں میں پڑی ہوئی نتیاں چمکنے لگیں تھیں ——— گھنشیام کے ماتھے پر بڑے بڑے نیل دکھائی دے رہے تھے اور صافہ یوں گلے میں پڑا تھا جیسے اُسے باندھنے کی فرصت نہ ملی ہو۔ یا پھر وہ لڑائی جھگڑے میں کھل گیا ہو۔

"شکر ہے ——! " رانو بولی ——

"میں تو آج گڑ بانٹوں گی جیتی! —— ہر کسی کے بننے کے بجائے یہ آج سرکار کے حلوائی بنے ہیں۔"

جیتوں نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو نے ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہا ——

"میں تو آج ناچوں گی، گدھا[1] ڈالوں گی۔"

اور پھر دروازے ہی سے مندر کے کلس کی طرف دیکھتے، اُس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بول اُٹھی ——

"شکر ہے دیوی ماں! آج تو نے سُن لی میری —— آج کا دن تو دھنّیہ ہو گیا میرے لئے..."

جب ہی تلوکے کا اِکّا دکھائی دیا۔ لیکن اُسے گوردا س چلا رہا تھا۔

"ہائے نی!" رانو نے جیتوں سے کہا۔ اور پھر اُسی طرف دیکھنے لگی۔

---

[1] پنجابی عورتوں کا ناچ جس میں تالی کو بہت دخل ہوتا ہے۔

اِکّے کے اندر کوئی لیٹا ہوا تھا۔

رانو نے سوچا ــــــــ 'شاید اُس مرگی والی کو کچھ ہو گیا ہے!' پھر سب سواریاں مل کر اُس لڑکی کو اُتارنے لگیں ــــــــــــــــــــــ

جب اُسے پاس لائے اور اُس کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا گیا، تو رانو ایک دم چلّائی ــــــــ "نہیں" اور پھر اندر کی طرف بھاگ گئی ــــــــ اور جنّتوں سر اور چھاتی پیٹتی ہوئی اپنے گھر کی طرف ــــــــ

تلو کا قتل ہو گیا تھا!

خانقاہ والے چاہ کے قریب اس نوجوان جاٹرن کے بڑے بھائی نے اُسے پکڑ لیا تھا اور اُس کی شہ رگ میں دانت گاڑ دیے اور اُس وقت چھوڑا جب اُس کے بدن میں خون کا ایک بھی نمکین قطرہ نہ رہا...

جس وقت لوگوں نے اُسے پکڑا، وہ نوجوان وحشت کے عالم میں آنکھیں پھیلائے، دونوں ہاتھوں کو اوپر اُٹھائے مندر کے کلس کی طرف دیکھتا ہوا، ایک مذہبی غیض و غضب، ایک جنون کے عالم میں چلّا رہا تھا؛

"تیرے نمت ——— ہے دیوی ماں ——— تیرے نمت ——— !"

اور لوگ اُسے مارتے دھاڑتے ہوئے لے جا رہے تھے اور وہ ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا:

"ماتا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں
میّا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں"

(ماتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں ——
میّا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں ——)

اور ان جوتوں کی چمک، اُس کی پھیلتی، کانچ ہوتی ہوئی آنکھوں میں پھیلی آئی تھی۔ بیچ میں اُس کا رنگ ایکا ایکی پیلا پڑ جاتا تھا، اور پھر ایک دم لال، کیسری ہو اُٹھتا۔

جب ہی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ وہ مندر کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اُس نے کود کود کے، اچھل اچھل کے لہک لہک کے گانا شروع کر دیا:

"ہے میّا ——— !
تسیں ستے بھیناں گوریاں
سر لال پُھلاں دیاں جوڑیاں

میا رانی دے دربار ـــــ جوتاں جگدیاں"

دا ے میا! ـــــ تم ساتوں بہنیں گوری

ہو ـــــ تمہارے سر پر لال پھولوں کی

جوڑی ہے)

اور وہ اپنے خون میں بسے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کر لہوا پنے سر پر مل رہا تھا ـــــ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے دیوی کی روح اُس میں چلی آئی ہے اور ایک انتقامی جذبے سے اپنا روپ کُروپ، اور آنکھیں لال بھبوکا کئے بھیروں، یا تلو کے کی طرف دیکھ رہی ہے۔

پھر وہ ڈنڈوت کے انداز میں مندر کے دروازہ پر لیٹ گیا، پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

لوگ ڈر سے کانپتے ہوئے اُسے چھوڑ کر الگ ہو گئے

وہ چاہتا تو اسی جنون کے عالم میں چلاتا، بھینٹیں گاتا ہوا کہیں بھی نکل جاتا ـــــ لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو نمبردار تارا سنگھ کے حوالے کر دیا ـــــ یہ بھی اُس کے جنون کا ہی ایک حصہ تھا۔

آس پاس کے پندرہ بیس گاؤں سناٹے میں آگئے

کوٹلے بھر میں کہرام مچ گیا ـــــ بے موسمے بادلوں نے سورج کی آب و تاب کم کر دی اور وقت سے بہت پہلے اندھیرا چھا گیا۔ وشنو دیوی مندر کے کلس، تلو کے کے گھر میں جھانکنے لگے۔ بکائن نے پتیاں سمیٹ لیں اور ڈبو نے، رونے، بھونکنے کی بجائے اپنی دُم ٹانگوں میں سکیڑ لی۔

حضور سنگھ کی آنکھوں میں پرماتما نے ایکا ایکی روشنی دے دی ـــــ بیٹے کی لاش دیکھنے کے لئے! ـــــ جنداں غش کھا کر دس بارہ گھنٹوں کے لئے بچوں کی چلاہٹ سے گذر گئی۔

رانو باہر دوڑی، پھر اندر چلی آئی۔ پھر باہر اٹھ دوڑی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

نہ معلوم کیوں اُسے گھر کے سب زیور، سب کپڑے پہننے کا خیال چلا آیا۔ وہ یہ سب کرنے والی تھی کہ چنوں نے پکڑ لیا۔ اور اُس کے ہاتھ دیوار سے مار مار کر چوڑیاں توڑنے لگی ـــــ پورن دئی، باہر سے مٹی کی مُٹھیاں بھر بھر کر لائی اور رانو کے سر پر خالی کر دیں ـــــ لیکن رانی اب تک کچھ نہ سمجھی۔ وہ پھر اندر لپکی اور بھنڈارے میں جا کر، گیہوں کے ڈھیر میں یوں ہاتھ مارنے لگی، جیسے حاملہ کُتیا 'چونہہ چونہہ' کرتے ہوئے، پنجوں سے

زمین کے پڑ... تے تک کھود ڈالتی ہے۔ رانی نے وہی شام لگا چھانٹا نکال لیا اور اُسے لے کر باہر سب کے سامنے چلی آئی اور کسی اندھے جوش سے نلو کے کی لاش کو دکھاتے ہوئے اُسے توڑ دیا اور بولی:

"لے میں نے توڑ دیا تیرا چھانٹا ــــــ بڑا مجھ پر توڑنے آیا تھا ــــــ"

سب سمجھے رانی پاگل ہو گئی ہے، رانی پاگل ہو گئی تھی اور نہیں بھی ــــــ بڑی، دیوار کے ساتھ کھڑی پہلے ہی چیخ پکار کر رہی تھی، اس پر رانو نے اُس کے پاس جا کر سر پر ایک دو ہتڑ جڑ دیا ــــ اور بولی:

"سب پہ گڑ ٹلے پڑنے ہیں۔ سب کو سیتلا نکلتی ہے سب مرتی ہیں، ایک تو نہیں مرتی۔"

ودیا نے بیچ میں آ کر چھڑا لیا۔ اِس غریب کا کیا قصور تھا؟ قصور کیوں نہیں؟ کیوں وہ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوئی جو اُس کا رہن چھڑائے بغیر ہی چلتا بنا؟

پھر چوکھٹ پر کھڑی رانو کو ایک پل کیلئے خیال آیا ــــ رو دے، رو دے گنتیئے! نہیں تو جمانہ تجھ پر ہنسے گا! ــــ ہنسے گا ــــ! لیکن رونا تھا جو کسی طور پر نہیں آ رہا تھا ــــ ایکا ایکی رانو کو اپنے پیچھے

کسی کے بچے معلوم ہونے لگے۔ اپنا گھر کسی کا گھر ـــــــ وہ پھر اندر گئی تاکہ پیاز ہی کوٹ کر اُس کا پانی آنکھوں میں ڈال لے، اور رو دے۔ رو دے! ـــــــ آخر اس کی ضرورت نہ پڑی۔ سامنے رکابی میں وہ ٹماٹر پڑا تھا جو تلوکا رات میٹھے مالٹے کے ساتھ کھانے کے لیے لایا تھا!

اب رانی کے بند ٹوٹے ـــــــ وہ رو رہی تھی، بین کر رہی تھی اور سر پر دوہتڑ مار رہی تھی ـــــــ اور گاؤں بھر کی عورتیں زار زار روتی ہوئیں اُسے روک رہی تھیں۔

رانی کے بینوں نے ساتوں آسمانوں میں چھید کر دیئے۔ منگل چلّا اُٹھا ـــــ "ماں!" ـــــ اور پھر دیواروں کے ساتھ اپنا سر پھوڑنے لگا۔

رانی چلّا رہی تھی ـــــ "رانی رنڈیئے! تیرا پچھا نہ آگا! ہائے رنڈیے! تیری شکل تو اب یا جار بیٹھنے والی بھی نہیں! ـــــ اب تو تُو پیٹ کرنے جوگی بھی نہیں..."

---

(۳)

چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشام اور
باداہری داس کو سات سات سال قید سخت کی سزا ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی
جاترن کے بڑے بھائی اُس لڑکے کو بھی اتنی ہی، کیونکہ لوگ مقتول کی لاش کو
نمبردار تارا سنگھ اور حوالدار جہان خاں کے پہنچنے سے پہلے موقع پر سے
لے جا چکے تھے اور وکیل صفائی، قاتل کے سلسلے میں ناگہانی اشتعال
ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

لیکن باداہری داس کو اتنی لمبی سزا کیوں؟ اُسے
اِس لئے کہ اُس کا لوہے کا لنگوٹ بوسیدہ سے کپڑے کا

نکل آیا تھا۔

باوا ہری داس کو ایسی عبرتناک سزا سُن کر کوٹلے کی سب عورتیں چپ ایک دوسری کے منہ پر کچھ ڈھونڈھنے لگیں ـــــ پکڑی گئی تو پورن دئی برہمنی جو سب سے زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی اور جس کے منہ سے ایکا ایکی "ہا" نکل آئی تھی اور آنکھوں سے آنسو ـــــ لوگ کہتے تھے، جب تک گاؤں پر مندر کی چھتر چھایا ہے اور دیادھرم والے لوگ، جوہڑ کے کنارے اُڑ کر آ بیٹھنے والے کبوتروں کو دانہ ڈنکا ڈالتے ہیں، کوٹلے میں کوئی پاپ نہیں ہو سکتا۔ ہوگا بھی تو اُس کی پوری سزا ملے گی، جیسی کہ بھیروں کو ملی تھی۔

چودھریوں کی حویلی، جائیداد، زمین وغیرہ سب مقدمے میں گئے۔ دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی آئی ـــــ اِس سانحہ کے بعد لوگ اِتنے چوکنے ہو گئے کہ اُن میں سے کسی کی ہمت عورت کو سامنے سے دیکھنے کی نہ پڑتی تھی۔ البتہ گاؤں کی گبھ گامنیاں جب اپنی مستی میں نکل جاتیں تو سب اُنہیں پیچھے کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھتے اور نظروں سے اُن کے اُٹھتے، گرتے کولہوں کے ساتھ تال دیتے اور کچھ دیر میں تال تک دینے کی ہمت نہ رہتی۔

حضور سنگھ کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا تھا۔ وہ چار پائی پر بیٹھا بڑھیا کی گالیاں سنا کرتا۔ جنداں اُسے ایک دن رو بیٹھنے کی منتظر تھی۔ کوئی زمانہ تھا جب حضور سنگھ نے اس عورت کو راج کرایا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے چڑیا گھر اور تو تا محل دکھائے تھے لیکن اب وہ بے کار، بے یار و مددگار گھر میں پڑا گرنتھ صاحب کے نویں محل کے شبد گنگنایا کرتا تھا جو دُنیا کی بے ثباتی کی تفسیر میں لکھے گئے تھے اور حضور سنگھ کو ایک عجیب طرح کا حوصلہ اور ہمت دیتے تھے۔ جنداں رات دن کے چوبیس گھنٹے چپکا کرتی۔ رانی کو تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تنکے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنی گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی کر دیتی:

"رنڈیے! ڈائنے! چڑیلے! ــــ میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لئے منہ پھاڑے ہوئے ہے ــــ چلی جا۔ جدھر منہ کرنا ہے کر لے اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے۔"

رانو ایک پل کیلئے بھی وہاں نہ رہتی، لیکن پاپی من جو ایک جالے کی طرح بچوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا، اسے کچھ

بھی نہ کرنے دیتا۔ جتنا جنداں اُسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی، اتنا ہی رانو اُس کے پاؤں پکڑتی۔ زندگی میں یوں ایکا ایکی بے قیمت ہو جانے سے وہ تیزی سے ڈھلنے لگی۔ جو چیزیں اُس کے بدن میں کم ہو رہی تھیں، وہی بڑی کے جسم میں بڑھنے لگیں۔ وہ پر پُھلی، جنگل کے پھول کی طرح اوپر نیچے، دائیں بائیں ـــــ سب طرف بے تحاشہ کھلنے لگی۔ کبھی اِس پھول کی ایک پتی گر بھی جاتی تو اُس کی جگہ دو اور نکل آتیں۔ اپنے آپ سے بے خبر وہ اُچھلتی کودتی، چاندنی رات میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نکل آتی، دیر سے گھر لوٹنے پر دھان کی طرح پھٹک دی جاتی۔ لیکن اُس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوتا۔ کچھ غریبی کی وجہ سے اور کچھ جان بوجھ کر، رانو اُسے پھٹے پرانے، تیل اور لسانڈ میں بسے ہوئے کپڑوں میں رکھتی، بال بنانے کی بجائے بکھیر دیتی، تاکہ اُس پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ بڑی گوری چٹی تھی اور پورو کے الفاظ میں، اُس پہ کسی "رنگیج"[1] کی اولاد ہونے کا شبہ پڑتا تھا۔

جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکار اُٹھتی:

"گورا رنگ نہ دئیں وے ربا!

---

[1] انگریز

"سارا پنڈ ویر پے گیا"

(گورا رنگ نہ دیکھو پرماتما! سارا گاؤں بیری
ہو گیا)

رانو جتنا بڑی کو چھپانے کی کوشش کرتی، اُتنا ہی اُس کا جوبن اُن میلے اور بوسیدہ کپڑوں میں پھٹ کر سامنے چلا آتا۔ وہ اُس معصوم اور متحیّر بچّے کی طرح تھا، جو باجے کی آواز سُنتے ہی بے اختیار کھڑکی میں آکھڑا ہوتا ہے بڑی کو یوں انجان اور بے خود دیکھ کر رانو سر ہلا دیتی اور کہہ اُٹھتی:

"اِس بے باپ کی بیٹی کا انت بُرا ہے۔ جس دن کسی دشمن کی نظر اس پر پڑ گئی، یہ کہیں کی نہ رہے گی۔"

اور مارے ڈر کے رانو کانپنے لگتی۔ اُسے سیلان کی بیماری ہو گئی۔ اُسکے بدن کی چربی یوں گھُلنے لگی، جیسے تپتے توے پر مکھن کی ڈلی گھلنے پگھلنے لگتی ہے۔

رانو کے حساب سے بڑی اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی۔ پچھلے ماگھ کی سنکرانت سے رانو کو بڑی کے "نہانے" کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا۔ کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اُس سے عجیب طرح کے اُلٹے سیدھے

سوال پوچھنے لگتی۔ "تیسرے پہر تُو کہاں تھی؟ پھر الشیراں کے ہاں سے کہاں گئی؟ مندر میں کون کون تھا؟ کیوں تو پروہت سے گورو منتر لینے بیٹھ گئی؟ جانتی بھی ہے یہ منتر تجھے کہاں پہنچائے گا؟ بھول گئی باداہری داس کو ——— ؟"

پھر وہ احتیاطاً گھر میں کاڑھا لا رکھتی ——— جھوٹ اور کفر کو اُبال پھینکنے کیلئے ——— جب کہیں دھڑکتے پھڑکتے ہوئے انتظار کے بعد اس بلوغ کے بوٹے پہ کوئی نیا گلِ انار کھِل اُٹھتا تو رانی کی جان میں جان آتی اور بڑی کو جلدی جلدی گھر سے نکال دینے کی سوچ میں لگ جاتی۔ لیکن گھر میں تو بیس کوڑیاں نہ تھیں اُسے رخصت کرنے، اپنے گھر بھیج دینے کیلئے۔

پھر رانو سوچتی: ——— وہ خود بھی تو روٹی کپڑے کے وعدے پر چلی آئی تھی۔ لیکن پاپی پرماتما نے جب اُس کی بچی کو زندگی کی سسرال میں بھیجا تو روٹی کپڑے کا بھی وعدہ نہ کیا! گاؤں کے نوجوان لڑکے، ہر دوسرے تیسرے شام ڈسکے جا کر سینما دیکھنے والے حرامی، بہن اور عورت میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ اتنا تو اُنہیں سمجھنا چاہیئے تھا، کوٹلے کی سب لڑکیاں اُن کی بہنیں ہیں اور عورتیں مائیں...

اِس پر بھی رانو، اِن میں سے کسی کے ہاتھ میں بڑی کا ہاتھ دے دیتی اور خود اِس سارے حساب کتاب اور اس ڈر سے چھٹی پالیتی لیکن وہ پُچھے، بدمعاش ـــــ سب کے سب مہر کرم دین کے باغ میں سے کھٹے توڑ، کچھ کھا، کچھ پھینک کر بھاگ اُٹھنے والوں میں سے تھے، اُن کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا۔

جانے بڑی کی قسمت میں ویر دوال تھا، یا ڈسکہ ؟ بڈھا گورا یا یا جاکی ؟ یا دور لاہور ؟ پشاور ؟ ـــــ رانو بیٹھی، سوچ کے گزوں سے جدائیوں کے فاصلے ناپتی اور پھر ایک عجیب عمل سے کھینچ کھینچا کر اُنہیں سکیڑتی، چھوٹا کرلیتی۔ اس پر بھی اُسے جھرجھریاں آتیں۔ بڑی کی مدد سے وہ اس کے "دہیج" دھیر کا کشیدہ کاڑھتے ہوئے گنگنانے لگتی :

"سبھناں سا ہورے چلنا، سبھ مکلاون ہار"

(ایک دن سب کو اپنی سسرال چل دینا ہے۔ ایک دن سب کا گونا ہوگا)

لیکن اُس کا اپنا گونا ؟ اُس کی اپنی سسرال جواب مائکہ ہو چکی تھی ؟ دماغ اور کشیدے کی اِسی اُدھیڑ بُن میں رانو یہ بھی بھول جاتی وہ گیت زندگی کا نہیں موت کا تھا!

پھر جیسے اپنے آپ رانو کی صحت ٹھیک ہونے لگتی۔

بدن میں ایک عجیب طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا جو اس کے دماغ تک کی طنابیں کھینچ ڈالتا اور رانو کا من سسرال جانے کیلئے تڑپنے لگتا۔ رانو جب سے کوٹلے میں آئی تھی، تلوکے نے اُسے سسرال کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا ــــــ سسرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دولہن کا۔ اُس کے سواگت کیلئے گھر کی چوکٹ پر سرسوں کا تیل گرانے کا، پیچھے باجوں، آگے نظروں کے ٹھٹھے کا، ساس کے چاؤ، سسر کے ملہار کا، گانی کھیلنے، برتن بدلنے کا، مُنہ دکھائی اور پھر رات کو موتیا یا کرنے کے پھولوں کا، دیے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر کھل جانے کا۔ ایک بہیمیت کے ساتھ ساتھ ایک اتھاہ مادریت کا ــــــ لیکن تلوکا، جہاں اُسے ہر روز دلتا، روندتا ہوا لے جاتا تھا، وہ وہ سسرال نہ تھی، جس ہی ہر لڑکی شادی کے بعد جانا چاہتی ہے! ہر عورت بیاہ کے برسوں بعد بھی جانا چاہتی ہے رانو ایکا ایکی سسرال اور گونے کے لئے جاگ اُٹھی، لیکن سسرال اور گونا تو اُس کی بیٹی کا ہونے والا تھا ــــــ نہ معلوم اپنا یا بیٹی کا؟ ــــــ اپنا ــــــ! اور رانو کا وہی گیت ایک نوحے میں ڈھل جاتا، جنداں کی کلیاں اور دُور دُر جیسے اور دلدل دزنبادیتیں اور وہ گانے لگتی:

"چھڈ وے سہیلڑی، جچر ساتھی نال"

(سہیلی اُس وقت تک بس سکے گی، جب تک ساتھی
اس کے ساتھ ہوگا۔ جسم اُس وقت تک کام کریگا،
جب تک روح اُس کی رفاقت کرے گی)

اس پروہ او باش ۔۔ منگل ۔۔ اور وہی اُس کا نصیبوں والا اڈہ۔ منگل نے بکی پر ساز لادنا تو سیکھ لیا تھا لیکن خود یہ گھر کی ذمہ داری کا جُوا نہ پڑنے دیا۔ آمدنی پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ زندگی میں ایکا ایکی چونک کر جاگا ہوا منگل جذبات و شہوانیات کے جنگل میں کھو گیا۔ ابھی وہ زندگی کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف نہ ہوا تھا لیکن اُسے "جا انجاست" کا احساس ضروری تھا۔ جب کبھی کوئی کنواری سامنے سے گزر جاتی، تو جیسے اپنے آپ یہ بول اُس کے ہونٹوں پر چلے آتے:

"نشے دیے بند بوتلے اینوں ہین گے نصیباں والے
دا ے نشے کی بند بوتل ! تجھے نصیبوں والے
پئیں گے"

اور نصیبوں والے اڈے پر اکا ہی نکنے والا منگل یہ بھول ہی جاتا، گھر کی طرف سے بھی اُس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے جہاں سب لوگ

اب ایک ہی وقت کھانا کھانے لگے ہیں۔

انہی دنوں منگل کی جہلم اراعین کی چھوٹی بیٹی ـــــ سلامتے ـــ سے راہ ورسم ہوگئی۔ سلامتے نے نہ صرف ترکاری ـ بھنڈی، بینگن اور توری ـــ ہی پر ہاتھ پیر نکال لئے تھے، بلکہ اُس کا پورا بدن بیل پر لگی ہوئی لوکی کی طرح ہرا بھرا اور نرم تھا۔ اِس پر بھی وہ ہوا کے معمولی جھونکے کے ساتھ جامن اور بکائن تو ایک طرف، کانٹے دار ببول سے لپٹتی پھرتی تھی۔ ایک دن اُس نے راہ جاتے منگل کو ٹوکا ـــــ

"اڑیا منگلا ـــــ!"

منگل، جو اِکّا لے کر نکل رہا تھا، گھوڑی کی باگ کھینچ کر رُک گیا اور سلامتے کی طرف مُنہ اُٹھا کر دیکھنے لگا۔ سلامتے نے پاس آکر آنکھیں مٹکائیں اور بولی،

"ہائے ہائے وے اٹّاں! ایک بار ہمیں بھی سیر کروا دے؟"

"کیوں نہیں سلامتے" منگل نے حامی بھری "گوتی (باندی) کس کی اور گہنے کس کے؟"

"کب کرائے گا؟"

"جب تُو کہے"

سلامتے آگے پیچھے دیکھ کر بولی۔

"آج ہی رات کو"

"ہی ——" منگل نے کہا۔ "میرا اکارات کو نہیں چلتا۔"

اور وہ بچّی۔ اپنی گھوڑی کو چابک لگا کر چلدیا۔

جب وہ سترہ کے راستے پر دو تین کوس نکل گیا، تب سلامتے کی بات کے معانی اُس کی سمجھ میں آئے۔ وہ گاؤں کی طرف مڑنے ہی لگا تھا کہ سواریاں الف ہو گئیں، اور پھر یہ سوچ کر کہ ابھی تو رات ہونے میں آٹھ دس گھنٹے باقی ہیں، وہ سترہ کے راستہ پر چلدیا، گھوڑی کو چابک لگاتے اور یہ کہتے ہوئے:

"چل میری بچّیے، شہر و شہر"

شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اس چھوٹے سے دمشق کی قحط سالی دیکھ کر سارا عشق بھول گیا۔ صبح سے کھانا نہ پکا تھا۔ بڑی نے کچھ چاول اُبالے تھے لیکن بھوکی رانو نے اُنہیں طباق پہ ڈالا اور بنا نمک مرچ کے کھا گئی، سوکھے ہی نگل گئی۔ ساس سسر تو ایک طرف، اُس نے اپنے بچّوں کو بھی نہ پوچھا تھا۔ اور اب جنداں اُسے

دھکے دے دے کر باہر نکال رہی تھی اور رانی پتھر بنی مار کھا رہی تھی۔
وہ چاہتی تو ایک ہی ہاتھ سے بوڑھی جنداں کے جسم کا رشتہ اُس کی روح سے علیحدہ کر دیتی لیکن وہ چپ تھی اور ایک انجانے ڈر سے کانپے جا رہی تھی۔

منگل اِس منظر کو دیکھ کر ایک مجرمانہ احساس سے بچائن کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ آج اُس نے صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے، جو گھر کے نون تیل کے لئے بھی کافی نہ تھے۔ اُسے اُلٹی طرف کی ایک سواری ملی تھی جو روپیہ سوا روپیہ دینے کو تیار تھی۔ لیکن سلامتے کے لالچ میں وہ جلدی ہی گاؤں لوٹ آیا۔

منگل نے جنداں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا:

"تائی! کیوں تو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے؟ کیوں روز مارتی، دھکے دیتی ہے؟ ـــــ آخر کہاں جائے گی بے چاری؟"

رانو، جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا، ایک دم بلک اُٹھی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑھکنے جوگی بھی نہ رہی۔

وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی:

"میں کیوں جاؤں؟ کیا نہیں کیا میں نے اِس گھر کے لئے؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی؟"

"منگل بولا: "قصور بھابھی کا نہیں، میرا ہے۔"

"تیرا خواہ مخواہ ہی؟" ——— جنداں کڑکی۔

"جو عورت اپنے بچوں کی نہیں، وہ اور کس کی ہوگی؟"

اور پھر وہ رانو کی طرف منہ کرتے ——— ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی: "گرو کے واسطے، بھگوان کے واسطے، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا ——— دفان ہو جا ——— جو اندھا کانا ملتا ہے کر لے، یہاں سے مر لے..."

رانو اُٹھی۔ مُڑتی ہوئی اُس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو: 'تو تو جننی ہے ماں! جگت ماتا ہے، تو تو مجھے مت دھتکار۔ جیسے تیسے بھی ہے مجھے رکھ لے میرا اِس دُنیا میں کوئی نہیں' ——— اور اسی ڈر سے وہ سب کے حصّے کا کھا گئی تھی۔ اب اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اِس گھر میں رہے بھی تو کیسے؟ بچے اب پل چکے تھے اور قاعدے سے اب وہ تلوکے کے تھے، اُس کے تھوڑے ہی تھے؟ ساس سُسر، گاؤں میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے تو وہ اُن کو لے کر کہاں جاتی؟ ——— خود

بھیک مانگتی یا اُن سے بھیک منگواتی ؟ بچے ـــــ بنتا، سنتا اور بڑی ـــــ ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی۔ اب بھی وہ اُس کی دیکھ ریکھ کے محتاج تھے ایک کو چھوڑنے کا خیال کرتی تو دوسری پسلی میں درد ہونے لگتا۔ نہ سب اتنے چھوٹے نہ تھے کہ ساتھ لے جا سکتی، اتنے بڑے نہ تھے کہ چھوڑ سکتی۔ ساس کے اُٹھتے جوتا ـــ بیٹھتے لات کے عمل سے رانو بھی اب یہی سمجھنے لگی تھی: جس عورت کا پتی مرجائے، اُسے اُس کے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک صبح چنوں آئی اور گلے میں بانہہ ڈال کر اپنے گھر لے گئی۔ ساگ کے ساتھ مکی کی روٹی کھلائی، جو رانو نے اِس ڈر سے تھوڑی کھائی کہ پھر نہ ملے گی

اور پھر چنوں مونڈھا سرکا کر رانو کے پاس بیٹھ گئی اور بولی۔

"دیکھ بی بی! میں تجھ سے ایک بات کہتی ہوں جو مانے تو؟"

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا۔

چنوں شروع ہوئی۔ "یہ جنداں ننیدی، یہ ساس تیری تجھے جینے نہ دے گی۔ اِس گھر میں بسنے نہ دے گی، یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے"

"کیا طریقہ ہے؟" رانو نے جاننے سے پہلے ہی ڈھارس

پاتے ہوئے کہا۔

"یہ کہ تو ـــــ منگل سے شادی کر لے ـــــ چادر ڈال لے اس پہ!"

"نہیں!"

رانو ایک دم کھڑی ہو گئی، "یہ تو کیا کہہ رہی ہے چنوں؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں ـــــ جب بڑا بھائی پورا ہو جائے تو..."

"یہ نہیں ہو سکتا ـــــ" رانو نے کہا اور اُس پہ ایک لرزہ چھانے لگا ـــــ منگل بچہ ہے۔ میں نے اُسے بچوں کی طرح سے پالا ہے عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ سال چھوٹا ہے... نہیں نہیں، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی۔"

اور رانو گھر بھاگ گئی۔

منگل بکی کے لئے دانہ لے جا رہا تھا، جب رانو گھر پہنچی۔ اندر جاتے ہوئے اُس نے مڑ کر ایک نظر منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی، اپنے آپ "نہیں نہیں... نہیں نہیں۔" کہتی ہوئی چلدی۔ پھر خود کو جھلنگے میں گرا، منہ چھپا کر رونے لگی۔

گھڑی بھر کے بعد منگل ساز لینے کے لئے اندر آیا۔

آج وہ جلدی نکل جانا چاہتا تھا کہ گھر میں چاول ہی نہیں گیہوں بھی آئیں۔ اور موٹی سی روٹی پکے جیسی کہ پکا کرتی تھی اور جس سے اصل پیٹ بھرتا تھا۔ چاولوں کا کیا ہے؟ وہ تو سیدھے پیشاب کے راستے سے نکل جاتے ہیں اور پھر پیٹ خالی' رب والی۔ ہو سکے تو ایک آدھ ترکاری بھی ہو جائے جس کے سواگت کے لئے منہ کی سڑک پر ابھی سے چھڑکاؤ شروع ہو گیا تھا۔ کچھ نہ ہو تو روٹی کے ساتھ پیاز ہی سہی' یا پھر لہسن کی کچھ تریاں۔ ودیا کے ہاں سے لسی آجائے گی' اور اس میں نمک اور لال مرچ ڈال کر روٹی کھالی جائے گی ...

ان سب باتوں سے زبان اور تالو مل کر ابھی سے چٹاخ پٹاخ کرنے لگے۔ ایک ہاتھ سے ساز کا گورکھ دھندا سمیٹ کر منگل نے رانو کی طرف دیکھا اور بولا۔

"کلگی کہاں ہے گھوڑی کی؟"

رانو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی۔ پہلے تو اس نے سیدھے منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی گھبرا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے بولی؛

"بچے تو گئے مدرسے"

منگل نے حیرانی سے رانو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا؛

"حد ہوگئی بھئی ——— میں چتر متری بچّی کی بات کر رہا ہوں اور تو بچّوں کی!" ——— اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ رانو کو کیا ہوا ہے اُس نے آگے بڑھ کر اُسے چھو دیا۔

رانو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو کر چلادی۔

"مت ہاتھ لگا مجھے"

منگل نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اور اپنی انگلیوں کو پوروں کو دیکھنے لگا ——— پھر اُسے کلغی مل گئی، جیسے ساز میں لگاتے ہوئے وہ بولا:

"اتنی سیانی، اتنی سمجھ دار ہو کر تو اب تک رات کی بات لئے بیٹھی ہے؟"

اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

رانو اٹھ کر دروازے تک گئی اور پیچھے سے منگل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کچھ دیر میں گلی کے نکّڑ نے لپک کر منگل کو چھپا لیا۔ اب ہیر گاتے ہوئے اُس کی صرف آواز آرہی تھی ———

"ہیر آکھیا، جوگیا جھوٹھ بولیں، کون رُٹھڑے یار مناوندا اے
ایسا کوئی نہ ڈِٹھا میں ڈھونڈھ تھکّی، جیہڑا گیاں نُوں موڑ لیاوندا اے"

دہیر نے کہا۔ "اے جوگی! تو جھوٹ کہتا ہے،

روٹھے یار کو منانے کون جاتا ہے ۔؟
میں ڈھونڈ ھتے تھک گئی، ایسا کوئی
نہ دیکھا جو جانے والوں کو واپس
لے آئے)...

---

(۴)

جینوں نے پورن دئی سے بات کی۔ پورن دئی نے اپنے شوہر گیان چند سے، جو گاؤں کا سرپنچ تھا۔ اور اس وقت کو ٹلے کی متنازعہ فیہ زمین کے ٹیلے ٹبے کھدوا کر، نیچی زمین پر مٹی ڈلواتے ہوئے راستہ ہموار کر رہا تھا۔ اُس نے جورو سے منگل کے گھر کی حالت سُنی تو بولا:

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ رانی بیچاری اور کہاں جائیگی؟ کیا کرے گی؟" ــــــ اور پھر سوچتے ہوئے بول اُٹھا ــــــ "مگر منگل تو رانی سے بہت چھوٹا ہے؟"...

"تو کیا ہوا؟ اُسے کون سی ہیرل جائے گی؟
گھر میں کھانے کو نہیں، بدن پر کپڑا نہیں، دونوں کا کام ہو جائیگا۔
دونوں سُکھی ہو جائیں گے..."

——— اور پھر گاؤں کے سرپنچ کو ڈرانے کیلئے وہ کچھ اور بھی اپنے شوہر کے قریب چلی آئی اور کہنے لگی ——— تم نے سُنا سلامتے سے اُس کا..."

"نہیں نہیں ——— نہیں تو"

"میں تو کہتی ہوں، اِن اراعیوں، اِن سُلوں کو گاؤں سے نکال ہی دینا چاہیئے ——— یہ جہلم اور تینوں بیٹیاں اُس کی، جو بیاہی ہوئی ہے وہ بھی اور جو نہیں ہے وہ بھی ——— سب ایسے گھومتی ہیں جیسے بُو پہ آئی ہوئی کتیا..."

"تو کہے جائے گی کہ مطلب کی بات بھی بتائے گی!"

گیان چند نے بے صبری سے کہا اور بولا ——— "کچھ ہوا؟"

"ابھی تو کچھ نہیں، ہاں ہو جائے گا"

گیان چند کیا اُمید لے کر سُننے آیا تھا لیکن سب مزا کرکرا ہو گیا۔ وہ بولا ———

"کچھ ہوا تو وہی حال ہو گا اُس کا جو چودھری مہربان سنگھ

کا ہوا، لوہے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کا ہوا۔"

پورن دئی نے نظریں جھکا لیں۔

گیان چند نے معنی خیز نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مت یہ سمجھنا، اب کے مقدمہ میں صرف مرد ہی بھگتیں گے۔ جب تک عورتیں برابری کا حق نہیں مانگتی تھیں ٹھیک تھا۔ اب لیں برابری کا حق!"

"میں ایک بات پوچھتی ہوں"۔۔۔۔ پورن دئی نے کہا۔

"تم نے جہلم کو دھرمشالہ میں کیوں بُلوایا ہے؟"۔۔۔۔ وہ اندر ہی اندر ہری داس کے نام کی بِس گھول رہی تھی!

"دھرمشالہ میں کہاں بُلوایا ہے؟ وہ تو مہر کرم دین کے باغ میں....." گیان چند نے کچھ ہکلاتے، پھر فوراً ہی راستہ پاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ "مسلمانی ہو کر وہ دھرم شالہ میں کیسے آسکتی ہے؟"

"اچھا! اب دھرم شالہ کی جگہ کرمو کے باغ نے لے لی؟"

"ارے نہیں ری سودائن! اُس نے باغ کے سب کیلے

توڑ لئے"

"تمہارے باغ کے تو نہیں توڑے؟"

"باڑ مضبوط تھی!" ــــــ گیان چند نے مسکراتے ہوئے کہا ــــــ "نہیں تو وہ کیا کم کرتی؟"

"باڑ مضبوط تھی، یا پہلے ہی آتے جاتوں نے توڑ لئے؟"

گیان چند کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ پورو سے نظریں بچاتے ہوئے وہ بولا ــــــ "اچھا، اچھا ــــــ تو بات کرنے آئی تھی منگل کی"

"منگل کی نہیں، رانی کی" ــــــ پورو نے تردید کی ــــــ

"رانی کی سہی ــــــ گیان چند بولا ــــــ "میں تو سمجھتا ہوں اُسے منگل کے ساتھ چادر ڈال ہی لینی چاہیئے۔ یوں بھی گاؤں میں آئی ہوئی عورت باہر کیوں جائے؟ اِدھر اُدھر کیوں جھانکے۔ اِس میں گاؤں کے ہم سب مردوں کی بدنامی ہوتی ہے..."

اور پھر مزدوروں کی طرف منہ کرتے ہوئے گیان چند نے بلند آواز سے کہا ــــــ "کامیو! گھیرو! سب زمین برابر کر دو۔ کہیں بھی اونچ نیچ نہ رہے..."

اور تن آور جوان کسیتوں اور کدالوں سے کام میں لگ گئے۔

ان کے جسموں پر تیل لگے، کسے ہوئے پٹھے، دور دور تک ہوائیں جلوتیاں مارتے، روشنی میں چمکنے لگے اور گیان چند سوچنے لگا ــــ

"ہمارے دیش پنجاب میں، جہاں عورتوں کی کمی ہے، کیوں مردوں سے اُن کا حق چھینا جائے؟"

پھر وہ گاؤں کی پنچایت سے الگ اور حضور سنگھ کی بھاٹیہ برادری سے الگ ملنے کیلئے چلا گیا۔

منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے کے لئے آئے تھے۔ بڑی معصوم کچھ نہ جانتی تھی۔ دادی کے کہنے پر مہمانوں کی خاطر خدمت کیلئے قندوڑ کرجنوں کے ہاں سے برفی لے آئی جس میں ماوا کم تھا اور شکر زیادہ۔ نفع گیر دوکانداروں نے ایک سیر ماوے سے پانچ سیر برفی بنائی تھی اور شہر کی یہ بیماری گاؤں تک چلی آئی تھی۔

وہ تین آدمی تھے: ایک ادھیڑ عمر کا تقریباً بوڑھا اور باقی کے دو جوان۔ ایک تو صاف اُس بوڑھے کا بیٹا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا شاید اُس کا دوست تھا۔ ہو سکتا تھا، بھائی ہی ہو لیکن شکل باپ پر نہ گئی ہو۔ دادی کے اشارے پر وہ بڑی کو اُٹھتے بیٹھتے، اندر آتے، باہر جاتے دیکھ رہے تھے نگاہوں سے تول رہے تھے۔ نوجوان کی نگاہیں تو پھر بھی اُچٹ کر پڑتی تھیں لیکن بوڑھے کی سیدھی۔ اور جہاں پہنچتیں وہیں چپک جاتیں۔

آخر جب بڑی نیچے گھڑے میں سے پانی ڈالنے کے لئے بیٹھی اور پھیلی تو بوڑھے نے بنکارتے ہوئے کہا۔

"ہاں ـــــ!" اور پھر بولا ـــــ ٹھیک ہے۔ سب ٹھیک ہے"

اُسی وقت بڑی کے ماتھے پہ سے کسی خیال کی پرچھائیں گزری اور اس سے پہلے کہ دادی جنداں اسے ٹل جانے کا اشارہ کرتی، بڑی ایک ہی زقند سے باہر بھاگ گئی۔ اور اپنے پیچھے ایک ایسی خوشبو چھوڑ گئی، جو نوخیز لڑکیوں ہی کے بدن سے آتی ہے۔

ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچسو پر فیصلہ ہوا۔ اس پر جنداں کو سوچنے سمجھنے کا موقع دے کر اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے گئے۔ حرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا، جب کہ رانو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چُننے گئی تھی ـــــ

جنداں اب سوچ رہی تھی، یہ رقم ان لوگوں سے لے گی کیسے؟ لڑکی انہیں دے گی کیسے؟ رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا! لیکن اُسے تو وہ اپنے دل سے، اپنے گھر سے ہمیشہ کیلئے بیگانہ کر چکی تھی۔

رانی لوٹی تو جنداں اسے لیپو پوتیاں کرنے لگی۔ اور

جب اُسے پاس بٹھا کر جنداں نے اُس کی بغل میں اپنی بوڑھی جھرّیوں ماری بانہہ ڈالتے ہوئے کہا ـــــ "تو جسنم جتما نتر کی بہو میری!" ـــــ تورانو کا ماتھا ٹھنکا ـــــ جب ہی بڑی نے باہر سے آتے ہوئے ماں کو اندر آنے کا اشارہ کیا جسے جنداں کی تقریباً اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں۔ رانو اُٹھ کر اندر گئی تو بڑی نے اپنی ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا۔ ساڑھے پانچسو کی بات بھی سُنا دی ـــــ وہ دروازے کے پیچھے سے سب سُنتی رہی تھی۔

رانو بڑی کے منع کرنے پر بھی، لپک کر باہر چلی آئی ـــــ وہ اپنی اوقات، اپنی ہمت، اِس گھر میں اپنا درجہ ـــــ سب کچھ بھول چکی تھی۔ وہ اُس مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچّوں کو بچانے کے لئے شکرے اور باز پر بھی جھپٹ پڑتی ہے۔

"آج کون آیا تھا یہاں؟ کس کی ہمت پڑی یہ دہلیز پھاندنے کی، میری بیٹی کا سودا کرنے کی؟"

جنداں ایک 'نا عورت' قسم کی مدافعت پر اُتر آئی:

"نہیں دھیئے! رانیے! وہ ایسے ہی بات کر رہے تھے ـــــ اب ہر کسی کا منہ تھوڑا ہی پکڑا جا سکتا ہے؟"

"ہاں پکڑا جا سکتا ہے۔ جُھلسا جا سکتا ہے ـــــ

رانو کوئی سُن تھوڑے ہی رہی تھی ——— "اُن حرام جادوں کی جبان کاٹ دینا تھی۔ منہ میں لٹ لٹ کرتا ہوا چو[1] ٹھونس دینا تھا۔ میری بیٹی جس کی ایک ایک بانہہ ایک ایک انگلی، ایک ایک پور لاکھ لاکھ کی۔ اس کی ایک ایک تکنی[2] میں سو سو موکھاں[3]، لوگوں کی ایک ایک نجر میں عمر قید۔"

"تیری بیٹی ہے ———" جنداں بولی ——— میری بھی تو کچھ ہوتی ہے، میری بھی تو پوتی ہے؟"

"پوتی بہو سے ہوتی ہے۔ جب بہو ہی نہیں تو پھر پوتی کیسی؟"

اور پھر ایک لمبی سی گھٹتی ہوئی "کھبردار" کہتے، ہاتھ لٹکاتے ہوئے رانو اندر چلی گئی ——— آخر وہی جھلنگا، وہی رونا۔ ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی؟ میں تو صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ دُردشا ہوئی، یہ تو بک جائے گی! اور وہ بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے، نوچ نوچ کے کھائیں گے۔ کہیں گے۔ "تجھے ایسے ہی تو نہیں لائے ہیں۔ دام دیے ہیں ———" تلو کے مرحوم کے زمانہ میں آخری یہی حربہ تھا رانی کا ——— "دیا تو نہیں دیا...... لیا تو کچھ نہیں۔ بیاہ کر لائے ہو۔"

---

[1] جلتی ہوئی لکڑی [2] نظر [3] موکش

خرید کے تو نہیں لائے ؟ ——— اور یہ بیٹی میری بک جائے گی ! گھر میں کھانے کو کچھ نہیں بیاہ ہو گا بھی تو کیسے ؟ ——— ایک لمحے کیلئے اُسے خیال آیا۔ آج مہربان داس چودھری ہوتا تو ایک ہی رات میں بیٹی کا جہیز تیار کر لیتی اور پھر اُسے اپنے سامنے طوطیاں بجاتی، ناچتی گاتی ہوئی برات، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی۔ اور جب ڈولی اُٹھتی تو دور کھڑی دیکھتی، روتی، دیکھتی ——— لیکن کبھی نہ کہتی ——— "بیٹی تیرے سہاگ کے لئے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا ———"

پھر ——— پانچ، ساڑھے پانچسو ملیں گے تو یہ پھاپھاں مجھے کچھ دے گی تھوڑے ہی ؟ آخر بیچنا ہی ہے تو ایک ہی بار ساڑھے پانچسو میں کیوں ؟ کیوں نہ اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور تھوڑا تھوڑا کر کے بیچوں ؟ لاہور میں سینکڑوں، ہزاروں بابو لوگ پھرتے ہیں، جو کچھ دیر کے دل بہلاوے کے لئے پندرہ پندرہ، بیس بیس روپے دے جاتے ہیں ! کھانے کو چنگی چوکھی ملے گی، پہننے کو ریشم، کھین کھاب[1] ——— تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق بھر جائیں گے۔۔۔

---

[1] کمخواب

جب ہی زناٹے کے ایک تھپّڑ کی آواز سنائی دی جو رانو نے خود ہی اپنے منہ پر مار لیا تھا۔ اور اب ہمیشہ کی طرح ایک انجانے خوف سے کانپنے لگی تھی...

جنداں رانو کا آخری فقرہ سوچ رہی تھی: ــــ 'پوتی بہو سے ہوتی ہے، جب بہو ہی نہیں تو پوتی کیسی؟' ــــ اُسی وقت گیان چند، کیسر سنگھ، جگو، دُلاّ، کرم دین اور گاؤں کے دوسرے آدمی چلے آئے اور آکر حضور سنگھ کے پاس بیٹھ گئے۔ جنداں کو بھی بُلوا لیا اور رانی کے چادر ڈالنے کی بات یوں چھیڑ دی، جیسے یہ بھی کوئی جھگڑا ہے جس کا فیصلہ پنچایت کو کرنا چاہیے۔ چادر کی رسم کی بات شروع ہو گئی۔ حضور سنگھ نے سمجھا ــــ 'اِس عمر میں، جب کہ وہ مرنے کے قریب ہے، پنچایت برادری کے لوگ، اُس کی بے عزتی کرنے، اُسے آخری ٹھوکر مارنے آئے ہیں' .. لیکن جنداں، عورت کی سریع الفہمی سے یکایک بات کی تہہ تک پہنچ گئی ــــ بلکہ اس سے بھی کہیں دور ــــ آگے ــــ بہت آگے نکل گئی۔ ایک لمحے کیلئے اُسے خیال آیا ــــ اتنا نزدیک، اتنا قریب کا خیال اُسے پہلے کیوں نہ آیا؟ ــــ پھر اُسے یاد آیا ــــ 'ہاں ہاں آیا تھا' لیکن جب بڑی کتنی چھوٹی تھی ــــ اب رانو پھر اُس کی بہو ہو سکتی ہے اور بڑی اُس کی پوتی! ــــ اور جب حضور سنگھ نے

پنچوں کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھیر پھڑائیں، تو بوڑھی دانت نکال کر اُسکی طرف بڑھی ـــــ ڈبّو کی بوڑی مری تھوڑی تھی ؟ وہ تو زندہ تھی ـــــ

جنداں ! ـــــ جنداں بولی :

" تو بیچ میں مت بولا کر بُڈھے ! نہ مرے، نہ جان چھوڑے۔ جانتا بھی ہے کیا کیا انصاف ہو رہے ہیں اِس دُنیا میں کہ اِس جنم کا اندھا تو لگلے جنم کا بھی اندھا ؟"

پنچ موجود تھے جنہوں نے بُڈھے بُدھی کا بھی فیصلہ کرا دیا اور آخر حضور سنگھ اور جنداں دونوں کی منظوری لے کر چلنے لگے۔ اُن کے جانے سے پہلے، بزرگ ہونے کے ناطے، جنداں نے سب کو آشیرواد دی۔

اِن سب کے پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ رانی بھری، بپھری ہوئی منظر پہ چلی آئی ـــــ

" تو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی پھاپھاں ! بیچ میں میرا مُردہ کیوں نکال بیٹھی !" ـــــ اور وہ بکے جا رہی تھی "شرم ہے تو کچھ کھا مر گھر میں بیسیوں ہولدیاں پڑی ہیں وافر ـــــ ہے دیوی ماں ! یہ جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب ڈوب مرے اوپر سے آٹے والی مشین کُو کُو کرے۔ تو میرے چمّوں سے کیوں

نہیں کرلیتی؛ بنتے کے ہاں کیوں نہیں بیٹھ جاتی؟ سنتے یہ کیوں نہیں چادر ڈال لیتی؟ میں اس سے بیاہ کرنے جاؤنگی جسے میں نے چھاتی نکال نکال کر...

جب ہی کوئی ہاتھ رانی کے بالوں پر پڑا اور وہ اُلٹی ہوئی، دیوار کے پیچھے، کوڑے کے ڈھیر پر جاگری۔ اُٹھی، نظریں صاف ہوئیں تو سامنے چنوں کھڑی تھی اور دانت پیس رہی تھی،

"رنڈیے، کھسم کھانیے، ایدھر مر" اور پھر اُسے مکان کے پیچھے، کھوے میں، جہاں گاؤں کے لڑکے لڑکیاں رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اور یا چور سیندھ لگاتے تھے، لے جاتے ہوئے بولی۔

"ہم تیرے بھلے کی کریں کُتیے! اور تو پھیلتی جائے؟"

"نہیں چنوں، نہیں۔" ——— رانو نے اُس کے سامنے دُکھڑا روتے، پاؤں پکڑتے ہوئے کہا ——— "وہ بچہ ہے، میں نے کبھی اسے ان نجروں سے نہیں دیکھا۔"

چنّوں بولی ——— "دیکھ! تجھے اِس دُنیا میں رہنا ہے کہ نہیں رہنا؟ اِس پیٹ کا نرک بھرنا ہے کہ نہیں بھرنا؟ اِس اپنی شرم کو ڈھانپنا ہے کہ نہیں ڈھانپنا؟ بڑی آئی ہے نجروں والی ——— کہا نہیں بُلھے شاہ نے:

بلھیا! رب دا کیہہ پانا؟ ——— ایدھروں پُٹنا، اوُدھر لانا

بس اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دینے کی بات ہے پہلے اُسے اِن نخروں سے نہیں دیکھا تو اب دیکھ، مُردیے!"

رانو اپنے تصور میں منگل کو دیکھ رہی تھی!

جنتوں بولتی چلی گئی ——— "سوچ تو مو یئے! دو شادیاں یہاں کس ماں جائی کو ملتی ہیں کرنے کو؟ جس کے ساتھ ہو گئی سو ہو گئی ——— بیچ میں دو چار ہو جاتے ہیں، لیکن وہ کوئی اچھی بات ہے؟ ہر بخت ڈر سے جان نکلی رہے ہے۔ ہاں، مردوں کی بات الگ ہے۔ یہ دُنیا اُن ہی کی۔ کوئی پوچھتا بھی ہے؟ کوئی جو باہر سے آکر تیرے منگل سے کرے گی، تو کیوں نہ کرے؟ سلامتی کی سُنی نا تو نے؟ ——— خیر، وہ سب باتیں چھوڑ۔ تجھے اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے کہ نہیں کرنا؟"

رانو پھر چونک گئی۔ "اپنا بیاہ کہ بیٹی کا؟ اپنا ———!"

وہ بچوں کی "نہ، نہ" کی ضد کرتی چلی گئی اور گھر پہنچ کر دن بھر بیٹھی سوچتی رہی، ——— سوچتی رہی ——— جبھی ایک اور ہی آگ اس میں لپک آئی، جس کا تعلق بڑی سے تھا، نہ چھوٹے دو بچوں سے اور نہ جموں سے ——— کوئی اور ہی ناپید نچے اس کے پیٹ میں

مچلنے لگے تھے۔

شام کے قریب پورو آئی تو رانو بیمار پڑی تھی
ایک پٹی سی سر کے گرد کس کر باندھ کر کھی تھی ——— بڑی چنوں موسی
کے یہاں جاکر آٹے کی چڑیاں سی بنوا کر لے آئی تھی، اور رانو نے
اُنہیں اپنی کنپٹیوں پر چپکا رکھا تھا اور وہ چڑیاں دانہ دانہ کر کے رانو
کی ساری گرمیاں چن رہی تھیں۔

پورن دئی نے تھوڑی مزاج پُرسی کی اور پھر مسکراتے
ہوئے کہا:

"کیوں نی! کیسا بُخار ہے؟"

اور رانو منہ موڑ کر مسکرادی!

اِس پر پوری کائنات ایک مخدوش سے طریقے پر کھِل اُٹھی
پورو ہنسی، بڑی کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہنسی کے اِس اِکا دُکا موقع سے فائدہ
اُٹھا کر کھلکھلا اُٹھی ——— نہ معلوم کب اور کیسے سنتوں، مہاتماؤں
رادھے کرشن اور شو پاروتی کی تصویریں اپنے آپ چوکھٹوں میں جا ٹکی تھیں اور
آن دیوی دیوتاؤں کے چہروں پر دُنیا بھر کی محبت کا نقش دوام ہو گیا تھا۔
بڑی کی کھلی سے بکائن پہ آئے ہوئے طوطے چہچہاتے ہوئے اُڑ گئے۔
مندر کے سنہری کلسوں پر سورج نے اپنا آخری گلال کھنڈ دیا ———

اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔

ایک دم ـــــ ایک دم کہیں سے منگل آکر دروازے میں کھڑا ہو گیا ـــــ وہ خوش تھا، بہت خوش ـــــ آج اُس نے سات روپئے کمائے تھے، جو اُس نے معمول کی طرح آتے ہی رانو کے ہاتھ میں تھما دئے ـــــ اور پورن دئی بول اُٹھی:

"لے، یہ پہلی کمائی! ـــ وہ کمائے اور تو کھا"

اور رانی نے گھبرا کر پیسے ہاتھ سے چھوڑ دیے! نوٹ بھنڈارے کی طرف اُڑنے لگا۔ اور سِکّے کچے فرش پر گر کر کونے کھدرے تلاش کرنے لگے منگل نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہنس کیوں رہی ہو چاچی؟"

چاچی بولی ـــــ "یہ تو اپنی اس سے پوچھ!"

اور پھر اُسے گھبرائی ہوئی رانی کے پاس اکیلے میں چھوڑ کر، بڑی کوہاہر گھسیٹتی ہوئی پورن دئی چل دی!

منگل پیچھے، بے وقوفوں کی ایک مخصوص، پُرخلوص ہنسی ہنسا اور کہنے لگا:

"کوٹلے کی سب عورتیں اِس قابل ہیں کہ ....."

رانو نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی ـــــ "مرد کم ہیں؟"

منگل کچھ نہ سمجھا۔ دونوں اپنے اپنے جال اور اُس کی گھنڈیوں
میں پھنسے ہوئے تھے۔ منگل نے اپنی ٹرنک میں سے کرتی اٹھائی جو کبھی بھلے
زمانہ میں اُس نے پشاور سے منگوائی تھی، جس کے گتے پر اون کا کشیدہ
اور لوکاٹ کے پھول سے بنے تھے اُسے ہاتھ میں لے کر لہراتا
ہوا وہ باہر نکلنے لگا۔ یہ کہتے ہوئے "کم سے کم مردوں کی بات سمجھ میں تو
آتی ہے۔"

"مردوں کی مردوں کو سمجھ میں آتی ہے۔" رانو بولی۔
"اور عورتوں کی عورتوں کو۔" اور پھر اُس نے آنکھیں ٹمکائیں۔ جو فن اُسے
لاکھوں، کروڑوں صدیوں سے آتا تھا۔

منگل نے جی ہی جی میں سوچا رانی ٹھیک کہتی ہے۔ کیا
اُسے معلوم تھا، کہ ڈھارے کے گھُپ اندھیارے میں جہاں چودھری کے
مکان کا ملبہ پڑا ہے، شہتیر کے پیچھے میں اور سلامتے ایک نئی ہی عمارت
کی نیو رکھ رہے ہوں گے؟

اُس نے دروازے میں سے مڑ کر رانی سے کہا۔
"یہ آج تو کیا مرد عورت کا جھگڑا لے بیٹھی ہے؟"
"وہی تو جھگڑا ہے سارا"
"کورو کھیتر دکورکشیتر، کی لڑائی ہے؟"

"اس سے بھی پرانی ——" رانی نے جواب دیا اور پاس آتے ہوئے بولی —— "جس میں جیتا ہوا بھی ہارا' اور ہارا ہوا بھی ہارا۔"

منگل رُک گیا اور رانی کی بات کا کوئی گہرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے۔ لیکن وہ سماں تھا' جب کوئی بھی بات کرو مطلب بن جاتا ہے' اور کبھی کچھ بھی کہو مطلب نہیں بنتا۔ اِس وقت مطلب تھا یا نہیں؟ اِس کیلئے دماغ چاہئے تھا یا وقت؟ اور دونوں کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں۔ رانو تینتیس چونتیس' برس کی بھرپور عورت تھی جس میں نسائیت انگڑائی لے کر جاگی تھی۔ اُس میں نوعمر' نوخیز لڑکی جیسی رعونت تو نہ ہو سکتی تھی' البتہ عورت پنے کا پورا غرور تھا جو برسوں' صدیوں سے حالات کے ردّے در ردّے کے نیچے دبکر رہ گیا تھا اور اُس وقت اُبل کر اُچھل کر نکلتا' جب اوپر کی سطح کمزور ہو کر راستہ چھوڑ دیتیں۔ بہ خلاف اس کے منگل' چوبیس پچیس برس کا گھبرو' شروع ہی سے دریا اور آخر دریا —— جو منبع کا محتاج تھا نہ دہانے کا اور نہ کنارے کا۔

باہر آ کر رانو نے یوں ہی برتن ٹکرانے شروع کر دیئے۔ جو

وہ چاہتی تھی وہی ہوا' منگل سلامتے کے پاس جانے سے رہ گیا ــــ ماں جنداں نے بیٹے کو آواز دی اور جب وہ پاس آیا تو اُسے بٹھا کر باتیں کرنے لگی۔ رانی مصلحتاً سٹک گئی ــــ بڑی کو اور جڑواں بچوں کو کھیلنے کیلئے باہر بھیجدیا گیا۔ رانی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ہو گئی' جو ہماری دُنیا کی اکثر عورتوں کی جگہ ہے۔

جنداں نے ابھی بات چلائی ہی تھی کہ منگل سمجھ گیا ــــ پگڑی میں سے اُسکے بال جیسے اپنے آپ باہر آنے لگے اور وہ اُنہیں ایک ہاتھ سے اُٹھا' دوسرے ہاتھ کی اُنگلی سے اندر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ دیے کی مٹ میلی روشنی میں اُس کا چہرہ خون کے ایکا ایکی دورے سے لال ہوتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

رانی نے کواڑ کے پیچھے چھُپ کر' دیوار کا سہارا لیتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ دیا' منہ سے جس کی دگڑ دگڑ سُنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی خونی اوپر کی منزل پر کسی کا خون کر کے اب بھاگنے کے لئے جلدی سیڑھیاں اُتر رہا ہے کونی دیکھتا' وہ کیسے ایک دم تو ریے کے بے بہارے پھُول کی طرح پیلی' کمہلائی اور مرجھائی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اُس کے ہونٹ دیوان شاہ کی

دوکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکڑ چکے تھے اور گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے، جیسے محبت یا خوف کے ایک بارگی حملے سے لرزتے ٹکراتے ہیں۔

منگل نے اُٹھ کر اندر کی طرف دیکھا، جہاں اُس کے قیاس کے مطابق رانی گئی تھی۔

"نہیں یہ نہیں ہو گا ـــــ یہ کبھی نہیں ہو گا!" ـــ اُس نے بائیں ہاتھ کو ایک فیصلہ کُن جھٹکا دیتے ہوئے کہا، جیسے وہ چھانٹے کو دیا کرتا تھا، جب گھوڑی بگی کو دلکی میں ڈالنا ہو ـــــ پھر وہ بولا ـــــ "میں ماں کی گالی نہیں کھاتا ـــــ اِن بچوں کی ماں کا ـــــ یہ تو کیا لاٹ اروِن، جارج پنجم بھی آ جائے تو میں یہ کبھی نہ کروں ـــــ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے، میں سر اس کے پاؤں پر رکھ سکتا ہوں ـــــ پاؤں سر پر نہیں"

اور وہ بکتا جھکتا، اِدھر اُدھر تبرے سُناتا، ہوا کو گالیاں دیتا ہوا، باہر نکل گیا اور منڈیر پہ ایک سایہ سا لہرایا، اور پیچھے ہٹ گیا۔

"ہائے نی! نی ...." جنداں نے چلّاتے ہوئے کہا "رانیے! انھئے (اندھی) دیکھ اپنے آپ کو کہیں کچھ کر ہی نہ لے ـــــ

کہہ کے گیا ہے ـــــ "گھر میں ایک اور تلو کے کی لاش آئے گی"۔

رانو لپکی، گری، پھر لپکی، حتیٰ کہ دروازہ کے پاس جا پہنچی، جہاں چنوں، پورن دئی، ودیا وغیرہ نے اُسے پکڑ لیا ـــــ

رانی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی ـــــ "ہائے نی۔ ہائے نی ....." اور اُس نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا۔

"کچھ نہیں کرے گا" چنوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ہائے کچھ کر لیا اِس نے تو میں مر جاؤں گی، ہم سب مر جائینگے سب کا ٹھیکرا مجھی پہ ٹوٹے گا"

"تو مرنا" ـــــ ودیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ـــــ ٹھیکرا توڑنے والی اور کون ہیں: ہم ہی ہیں!"

"ہے دیوی ماں! ـــــ میرا تو سارا بدن ٹھنڈا ہوا جا رہا ہے ـــــ" رانو اپنے تشنجی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پورو کا سہارا لیتے ہوئے بولی۔

چنوں رانی کے ہاتھ دباتے، اُسے ہوش میں لاتے ہوئے بولی ـــــ "تجھے ہی تو گرم کرنے کیلئے یہ ساری مصیبت کی ہے کیا برف ہوئی جا رہی تھی۔

"مجھے بچا لو چاچی ـــــ!" رانی نے پورن دئی کے پیر

پکڑتے ہوئے کہا۔

پورو نے اپنے پیر چھڑالیے اور بولی ـــــــــ

مری کیوں جا رہی ہے؟ کچھ ہونے والا نہیں۔ اِن موئے مردوں پہ جب لادی ڈالی جاتی ہے۔ سب ایسا ہی کرتے ہیں۔ ہم عورتیں یہ تہ کریں۔ تو سب کی سب دھری رہ جائیں تو تو جانتی ہے!"

رانو کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا ـــــ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اور بدستور لرزتی، کانپتی ہوئی چنوں کی طرف دیکھ کر بولی:

"وہ کیا کرے گا؟"

"جو تو نے کیا!" چنوں نے کہا۔

"کیا سوچے گا؟"

"جو تو نے سوچا"

بڑی پاس کھڑی سن رہی تھی اور اب تک معاملہ کو کچھ کچھ سمجھ چکی تھی وہ ایک دم بولی ـــــ

"ماں نے یہ سب کیا تو میں کچھ کھا مروں گی"

اِس پر سب عورتوں نے اپنی اپنی ناک پر اُنگلی دھرتے

ہوئے ایک لمبی گھٹی گھٹی ہوئی "ہو ہائے" کی اور پھر چنوں نے بڑھ کر بڑی کی چوٹی کھینچ ڈالی اور باقیوں نے دھکّے دے کر اُسے اندر بھیج دیا۔

بڑی جب اندر گئی تو شرم، نفرت اور کدورت سے اُس کا چہرہ سوج رہا تھا۔

---

(۵)

منگل ڈھارے میں پہنچا ـــــــ سلامتے کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی منگل کے گھر جا کر جھگڑا ہوتے سُن آئی تھی، جو اُس کی سمجھ میں نہ آیا تھا، اب وہ لوٹ کر منگل کا انتظار کر رہی تھی ـــــــ اُس کے دماغ میں ایک بولی تھی، جسے وہ منگل کو سنانا چاہتی تھی ـــــــ

"ہُسدی نے چند منگ لئے' یار چھڈ گیا گلی دا آنا"

(ہنسی ہنسی میں جھوم کر کیا مانگ لیا کہ یار نے گلی ہی میں آنا چھوڑ دیا)

جب ہی سامنے منگل دکھائی دیا وہ غصے سے ہانپ رہا تھا۔

ایک پل ٹھٹھکنے کے بعد وہ آکر سلامتی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا ——— سلامتی اپنی جگہ سے اُٹھ کر منگل کے پاس آئی اور اُس کی خاموشی میں ہزار مطلب تلاش کرنے لگی، اور پھر ہزار مطلب میں ایک ہی مطلب ——— وہ آج بن ٹھن کے آئی تھی۔ اپنی بڑی بیاہی ہوئی بہن عنایتی کا دوپٹہ اُڑا لائی تھی، جس پر مقیش لگی تھی، جو کہیں دور سے آتی ہوئی روشنی میں چمک چمک جاتا تھا ——— شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سلامتی کے بدن پر لپٹا ہوا دوپٹہ یوں کانپ رہا تھا، جیسے پیٹھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے...

منگل کی آنکھیں، اندھیرے کے باوجود، ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں ——— سلامتی کے پاس پہنچکر اُس نے اپنا پاؤں بلے کے پاس پڑے ایک شہتیر پر رکھ دیا، جس کا بہت سا حصہ لوگ کاٹ کر جلانے کیلئے لے جا چکے تھے ——— آہستہ، مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا:

"سلامتے!"

"ہوں!" سلامتی ایک میٹھی سی آواز میں بولی۔

"اِدھر آ" وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آکر رُک گئی۔

"اُتار دے دوپٹہ" منگل بولا۔

سلامتے نے دوپٹہ الگ پھینک دیا۔

"نکالدے قمیص"

سلامتی نے قمیص اُتار دی ـــــ ایک لڑکی کے لئے سب سے مشکل بات، لیکن اُس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی سلامتی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی۔ دایاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی۔

شاید وہ کچھ کہتی، لیکن منگل نے اندھیرے میں کہیں دور سے اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لَو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اُسی وزنی آواز میں بولا۔

"ہوگئی سیر، اب چلی جا"

سلامتے نے جھونچکی ہو کر اپنے کپڑے اُٹھائے۔ جلدی جلدی قمیص گلے میں ڈالی اور پھر گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں آگے دیکھتی، پیچھے مُڑتی ہوئی چلدی۔

اُسی وقت کوئی پاس سے گذرا اور جیسے خاموشی کا مُنہ پاٹنے کے لئے بول اُٹھا ـــــ "کون ہے اوئے؟"

منگل نے ایک دم تاڑ میں آکر نتھنے پھُلا لئے اور بولا ـــــ

"توکون ایں اوئے، ماميا ؟" —— اور وہ آدمی لمحہ بھر کے لئے ٹھٹھک کر اپنی راہ پہ ہولیا۔ وہ مقتول نہ تھا۔

منگل کچھ دیر وہیں کھڑا ارد گرد کی فضا کو سونگھتا رہا اور پھر ایکا ایکی بائیں ہاتھ کو چھانٹا لگانے کے انداز میں جھٹک کر، سلامتے کے گھر کی طرف، ساہنیوں کی ٹھٹی میں کہیں غائب ہوگیا —— ساہنیوں کی ٹھٹی جو ہمیشہ گاؤں کے ایک طرف ہوتی ہے، جہاں ارائیں، چھیتے، چمار مصلی وغیرہ رہتے ہیں اور جس کی طرف گاؤں کی گندی موریوں اور بدروؤں کا نکاس ہوتا ہے۔

رُلا رہی تھی اور پھر جیسا کہ بندوبست کیا گیا تھا، سب بچوں کو چنّوں موسی کے گھر بھیج دیا گیا۔

آنگن میں پیتی کی میلی سی چادر تنی ہوئی تھی، جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے ـــــ ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اور ان سب پر سیندور مچل رہا تھا ـــــ رانو کو لا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اُس نے ایک دلدوز چیخ ماری:

"مرنے والے! آ دیکھ، کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ؟"

پروہت نے کہا ـــــ "لڑکا کہاں ہے؟"

پنڈت گیان چند، کیسر سنگھ اور دوسرے لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ تو اُسے زبردستی پکڑ کر لائے تھے اور چارپائی سے باندھ دیا تھا۔ مہر کرم دین، جو اس رسم و رواج سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا تھا، ڈھونڈھتا ہوا اندر گیا اور انہی پیروں لوٹتے ہوئے بولا۔

"منگلو تو اندر نہیں ہے!"

اُس دن اُتر سے آنے والی ہوا، طنابوں کی مدد سے ایک طرف بکائن اور دوسری طرف روشندان کی سلاخوں سے بندھی ہوئی چادر کو پھڑپھڑا رہی تھی، مُفت کی دف بجا رہی تھی۔ چادر کے نیچے رسیوں کے ساتھ ساتھ بندھی ہوئی کاٹھ کی چڑیاں لہراتی ہوئی چوں چوں کرنے

(۶)

پنچوں کی مقرر کی ہوئی تاریخ آ پہنچی ــــــ پورو، چینوں اور وِدّیا نے مل کر رانو کے ہاتھوں پر مہندی لگا دی اور کنگھی کر کے اس کی مینڈھیاں گوندھ ڈالیں اور سر پر خوبصورت سا ڈاک بنگلہ بنا دیا۔ اتنا دلاسا دیے جانے کے باوجود، رانو کانپ رہی تھی، رو رہی تھی۔

بچّے ناسمجھی کے عالم میں چپ تھے اور سوچ رہے تھے آج اُن کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ بڑی اُن کے گلے میں اپنی لانبی لانبی باہیں ڈالتی ہوئی، چپ کراتے کے بہانے اُنہیں

لگیں۔ کچھ دور تنور کے پاس اس کی بھبھل میں لیٹے ہوئے ڈبو نے اپنی ٹانگوں میں دبائی ہوئی گردن اُٹھائی اور مشکوک انداز میں اس پورے منظر کو دیکھنے لگا۔ وہ اب تک بوڑھا اور نحیف ہو چکا تھا، نہ زیادہ روشنی برداشت کر سکتا تھا اور نہ شور ——— وہ گاؤں کے مرد عورتوں کی بے طور حرکتیں دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اندازے ہی کے ساتھ دشمن پہ بھوں بھوں کرنے لگا۔

"میں تو جانتا ہوں، وہ نطفہ..." حضور سنگھ نے کہنا شروع کیا۔

"دُر، دُر!" جنداں حضور سنگھ کو پھٹکارتے ہوئے بولی۔ "سوائے بکتے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہیں ———"

اور وہ اپنی مردہ، بے نور سی آنکھوں سے اِس جمگھٹے کی طرف دیکھنے اور سنسانے لگی ——— وہ نہ جانتی تھی، اب آسمان سے اگلی کون سی بلا نازل ہونے والی ہے؟ چونکہ اس کی آنکھیں دُھندلی تھیں، اس لئے اپنے مقتول بیٹے کی شکل اور بھی کھُل کر اُس کے سامنے آ رہی تھی۔

"ٹھہراوئے باہمنا!" ——— نمبردار تارا سنگھ نے پروہت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میں لاتا ہوں اُس ماں کے یار کو پکڑ کے۔"

"ہاں" ـــــ کیسر سنگھ نے حامی بھری ـــــ

"اُس کی میں بہن کے بیاہ میں جوتے کھاتا پھروں..."

"ہم سب چلتے ہیں ـــــ" جگو بھی تیار ہو گیا۔

دیوانا بولا ـــــ اِتنے جوتے پڑے اِس پہ بھی بھاگ گیا!"

گویا اِس سے پہلے، اسے "ٹھیک کرنے" "سیدھے راستے پلانے" کے سلسلہ میں گاؤں کے لوگ اس سے "ٹیڑھے" ہو چکے تھے ـــــ وہ تو چاہتے تھے، اس کی ایک آدھ ٹانگ ہی توڑ دی جائے تاکہ چادر کے نیچے آکر بیٹھے تو پھر ہل ہی نہ سکے۔ چھ سات آدمی ہاتھ میں لٹھیں اور گنڈاسے لیے ہوئے باہر لپکے اور گیان چند سرپنچ، قانون کا سرسری محافظ، صرف دکھاوے کے لئے منع کرتا، شور مچاتا ہوا، سب سے پیچھے... وہاں صرف عورتیں ہی عورتیں رہ گئیں، جن میں سرمادائی بھی تھی، جو منگل کو اس دُنیا میں لائی تھی۔

مردوں کو یوں نکلتے دیکھ کر رانو واویلا کرنے لگی ـــــ

"چھوڑ دو۔ ہائے نی مجھے چھوڑ دو، میں نہیں بچوں گی۔"

اور یہ سب ٹھیک ہی معلوم ہو رہا تھا، ـــــ رانو پیچھے کی طرف گری اور بے ہوش ہو گئی۔ عورتیں اُسی شادی کیلئے رکھے ہوئے گھڑوں میں سے پانی اُنڈیل اُنڈیل کر رانو کے منہ پر چھینٹے دینے اور اُسے ہوش میں لانے

لگیں ـــــ گویا وہ کہہ رہی تھیں، 'اِس نے موت دیکھی ہے تو اب شادی بھی دیکھے'

منگل کو لوگوں نے فارم کی ساتویں کپاس میں جا پکڑا ـــــ وہ پہلے ہی مار کھا چکنے کے بعد نڈھال ہو چکا تھا' اب دہشت سے اور بھی نیم جان ہو گیا۔ وہ چاہتا تو اِکا لے کر ہمیشہ کی طرح ستراہ یا ستّو کی کی طرف نکل جاتا۔ لیکن شومئی قسمت، اِس مرنے کی بکی کو بھی استہزا کی صاحبان نے "ڈھنگ" دیا تھا۔ بکی اپنی بندھی ہوئی اگاڑی کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی ہری ہری چرّی اور موٹھ کھا رہی تھی اور موقع پڑنے پر ساتھ والے کھیت میں لہلہاتی گوار کو بھی منہ مار لیتی تھی۔ گاؤں والوں نے ممکنات کا خیال رکھتے ہوئے بکی کے پاؤں میں لوہے کا یہ بڑا اور موٹا سا سنگل ڈال دیا تھا اور اُس پر علی گڑھ کا تالا اور اب وہ بے فکر ہو چکے تھے۔ منگل کا خیال تھا کہ اُس کے یار غار، نواب، اسمٰعیل اور گورداس وغیرہ اُسے اِس سانحہ سے بچائیں گے۔ لیکن اُسے کیا معلوم کہ وہ بے غیرت بھی کوٹلے کے باقی لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے اور بار بار یہی کہیں گے "آخر عورت ہی کی بات ہے نا' یار! کوئی موت کی تو نہیں؟"

منگل جہاں چھپا تھا' وہاں سے دو ہاتھ دور خانقاہ والا کنواں تھا' جہاں آج سے چند ہی برس پہلے' منگل کے بڑے بھائی تلوکے کا

قتل ہوا تھا۔ جب شام کے وقت سمے سے پہلے ہی گھُپ اندھیرا ہو گیا تھا، اور ایک دن پہلے سورج نے زمین کی بکائن پر خون کے چھینٹے پھینک دئے تھے۔ اس مٹی سے اب بھی خون کی بو آ رہی تھی۔

منگل کپاس کے بغل میں ایک تنگ و تاریک "کُڑھ" میں بیٹھا، شنک اور وسوسہ میں بٹا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا، جبکہ گاؤں کے لوگ پہنچ گئے ——— سردیوں کے موسم میں کبھی کبھی کوٹلہ گاؤں میں کوئی بھیڑیا، یا جنگلی سؤر آ نکلتا تھا اور لوگ اسی طرح لاٹھیاں اور چھویاں، ٹوکے اور گنڈاسے لے کر اُسے گھیرنے مارنے کیلئے نکل جاتے تھے اور آخر اُسی وقت دم لیتے، جب گھِرے ہوئے جانور کے پرخچے اُڑ جاتے۔

لوگ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے ——— منگل کوٹھڑی میں، دو ہاتھوں کے بل جھکا، دہشت کے عالم سب کو دیکھتا ہوا سچ مچ ایک جنگلی سُؤر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہتا تھا اور باقی سب کے سب مسلح۔ کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اُٹھا رکھا تھا۔ اور کہاں وہ اب آ کر سامنے کھڑے ایکا ایکی چُپ ہو گئے تھے، ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے، گھور رہے تھے ——— دیکھیں پہلا وار کون کرتا ہے، شکار کس طرف لپکتا ہے؟

منگل کا زخرہ کانپنے لگا اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہو کر خالی زمین ہی پہ لاٹھیاں برسانی اور ٹوکے چلانے شروع کردیئے شدید ڈر نے اُن میں ایسا جوش، ایسی طاقت بھردی کہ زمین میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے۔

ایک بار پھر وہ ایکا ایکی چپ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ شکار اور شکاری! ——— منگل کے اپنے دوست، اپنے ساتھی، اِکے والے گورداس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا: ——— "دیکھتا ہوں یار کون سا جگّا ہے؟"

گورداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ، حکو، نواب، اسمٰعیل سب جھپٹ پڑے۔ ان کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ منگل نرغہ میں سے نکلنے کے لئے لپکا۔ پھر متداول، ہراول اور قلب سب طرف سے لوگوں نے اُسے آلیا۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، لاٹھی، جس کے ہاتھ میں جوتا تھا، جوتا منگل پر برسانے لگا۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈاسے اور ٹوکے بھی تھے۔

شور شرابا سن کر راہ گیر جمع ہو گئے۔ منگل کو بالوں سے پکڑ کر کھیتوں اور کھلیانوں کے بیچ گھسیٹا جا رہا تھا۔ سکھ ہونے کے ناطے نمبردار تارا سنگھ کا یا کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کی بے حرمتی سے بچتے لیکن یہ کسب

کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں مزا اور انتقام لے رہے تھے ـــــ گھسیٹے جانے کی اذیت سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی سے چل لیتا لیکن پھر پیچھے کی طرف کھنچنے لگتا جیسے کسی اڑیل ٹٹو کو پانی پلانے لے جا رہے ہوں ـــــ اُس کے بدن، پھٹے ہوئے کپڑوں، لمبے لمبے کیسوں اور داڑھی میں دھرکونے کی جھاڑیاں، کپاس کی من چھٹیاں، مکئی کے ٹانڈے، خشک آک میں سے اُڑنے والی بڈھی مائیاں اور نہ جانے کیا کیا کچھ گھسٹتا آرہا تھا۔

جوہڑ اور دھرمشالہ کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس خاصا بڑا ہوگیا۔ مسافر سڑک کے ایک طرف رُک کر حیرانی سے دیکھنے لگے۔ کیکر کی باڑ کے پیچھے سے اُچک کر ایک راہ گیر عورت نے گاؤں کی ایک مٹیار سے پوچھا ـــــ

"ہائے ہائے نی سُکھو! یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سُکھو نے عورت کی طرف اِس نظر سے دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو "ہو ہائے" بے بے! اتنی سیانی ہو کے تو یہ بھی نہیں جانتی؟" اور بولی ـــــ "شادی" اور پھر وہ لوٹ کر یوں دیکھنے لگی، جیسے کوئی بات ہی نہیں۔

کوٹلے سے دور، وشنو دیوی کے پہاڑ کا خاکہ اب بھی دھندلا سا نظر آرہا تھا۔ اِس وقت ضرور وہاں بے شمار جاتری پہاڑ کی پرکرما کرنے جا رہے

ہوں گے، کیونکہ اِسی پورنیما کو وشنودیوی میں جاتریوں کا اکٹھ تھا۔ وہ ضرور ڈھولکیاں، چھینے بجاتے ہوئے گا رہے ہونگے ـــــ بچانا ہے تو بچالو امباجی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے۔ گاتے، بجاتے ہوئے اُنہوں نے ضرور دکھن کی طرف دیکھا ہوگا۔ اور ضرور اُن کی نظریں کوٹلہ گاؤں کے دھند لئے اندھیارے سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں گی۔

گاؤں سے باہر ہی ایک نشیب تھا، جو سریچ گیا پچند اور مزدوروں سے پاٹنا رہ گیا تھا۔ جس میں منگل، مار کھاتا ہوا منگل بے سُدھ ہوکر گر گیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑی بڑی کسیوں اور کدالوں سے کھدائی کرکے جوہڑ کے پانی کو اندر لایا جاتا تھا اور پھر مٹی کی گول گول ٹنڈوں کی مدد سے اوپر چہلم ارائین کی کیاریوں کی آبیاری کی جاتی تھی، جس کی وجہ سے اُسکی کھیتیاں سدا بہار رہتی تھیں۔ پھر ان پر پھروانہہ کی سنسناتی ہوئی چھاؤں، جس میں بے شمار مسافر سستا چکے تھے۔ اس وقت کچھ دنوں کیلئے بند باندھ کر پانی کو روک دیا گیا تھا لیکن منگل کے چاروں شانوں چت اِس میں گرنے سے بند ٹوٹ گیا اور جوہڑ کے پانی کیلئے راستہ بن گیا، اور وہ تیزی کے ساتھ اندر آنے لگا ـــــ اِس سے پہلے کہ لوگ منگل کو اُٹھاتے، اس کے کپڑے پانی سے گیلے اور منہ کیچ میں لت پت ہو چکا تھا ـــــ منگل نے کئی بار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی، لیکن آٹھ دس مضبوط بازوؤں کی

جوڑیاں اپنے گرد پاکر وہ شرابی کی طرح بھکارتا ہوا راستے پر ہولیا۔

عجیب سا دولہا تھا: بال بکھرے ہوئے اور سر پر سے پگڑی ندارد۔ ہاتھ میں کنڈسی کرپان، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے۔ کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے لودے۔ آنکھوں میں محبت کی بجائے نفرت، ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلاپن اور عجیب سی برات، جیسے شیوجی پاروتی کو لینے آئے ہوں ____ گلے میں رودراکش کی مالائیں اور سانپ، منہ میں دھتورہ اور بھانگ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ چھالا اور ہاتھوں میں ترشول۔ براتی بندر اور لنگور، شیر اور چیتے اور ہاتھی ____ اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کُتا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی کو......کو......کو!

جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہولہان تھا، اور رانو مکمل طور پر بے ہوش۔ لیکن سب عورتوں کو یقین تھا، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا ____ اگرچہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا، لیکن یہاں جنتوں اور پورن دئی، ودیا، کنی اور چنڈی نے مل کر ایک پوری شادی کا سامان کردیا تھا، ورنہ وہ سب ضائع ہو جاتا ____ لڑکا عام طور پر لڑکی کے یہاں جاکر اُسے

بیاہ کرلاتا ہے لیکن اِس وقت لڑکی کا مائیکہ بھی یہیں تھا اور سسرال بھی یہیں، آگا بھی یہیں، پیچھا بھی یہیں ـــــــ پورن دئی یا ممنی، ودیا اور کچھ دوسری عورتیں لڑکی کے ماں باپ، مائیکے کی طرف سے ہوگئیں، جنداں، چنوں، سرد پو، جینڈی اور سرما، سسرال کی طرف سے۔ سب ایک دوسرے کی سمدھنیں بنیں، آمنے سامنے صف آرا ہوگئیں، جیسے کوئی لڑائی لڑتے جا رہی ہوں۔

ماں کی حیثیت سے جنداں نے اپنے تقریباً پوپلے سے منہ کو جنبش دی، اور گھوڑی گانا شروع کی:

"ارے بنے!
چھوٹی چھوٹی بوندنیاں مینہہ برس رہا ہے
سہاگن ماں تیرے شگن منا رہی ہے

اور پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے چنوں، سرد پو اور سرما وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو ایک ہی ساتھ شروع ہوگئیں:

"بہن سہاگن تیری گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے ہے، بنے!
بھابھی سہاگن سرمہ ڈال رہی ہے۔
اور باپ تیرا، زر کی تھیلی کا منہ کھولے کھڑا ہے۔"

اُسی وقت بڑی، بھائیوں کی قطار لیے چھت پہ چلی آئی۔ چھوٹا جموں پیچھے

آنے اور باجا سُننے پر مچل رہا تھا ـــــ بڑی اُسے منع کرتی، مارتی رہی تھی لیکن اُس کا اپنا جی وہ سب کچھ دیکھنے سننے کو چاہ رہا تھا۔ چنوں موسی کے ہاں سے نکلنے، کوٹھے پر آنے کی دیر تھی کہ سب ہی پیچھے آگئے اور منڈیر پر کھڑے ہو کر اپنی ماں کی شادی دیکھنے لگے ـــــ بڑی پہلے آٹھ آٹھ آنسو روئی اور پھر وہاں کا رنگ دیکھ کر ایک بچی کی طرح سب کچھ بھول کر نیچے کی طرف سرکنے لگی۔ ودّیا نے چلّا کر کہا:

"اٹیو! ـــــ گاتی کیوں نہیں ہو؟"

اِس پہ سب نے اپنی اپنی آواز بلند کر دی ـــــ تارا سنگھ، گیا پنچند، کیسر سنگھ، جگو، رلدو، جمالا، دُلّا اور گاؤں کے مصلّی، جو کچھ دور کھڑے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، ایک دم بول اُٹھے: "گاؤ! گاؤنا"

اتنے میں رانو کو ہوش آگیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے، کیا مرد، کیا عورت، سب کو دیکھنے لگی، جیسا کہ دُلہن کبھی نہیں کرتی...

ودّیا نے گیت اُٹھایا اور پھر باقی بھی سب کی سب شامل ہو گئیں۔

"پیلی پیلی دال تیری گھوڑی چرے۔
اور میرا بنا ـــــ لپک کر گھوڑی پر سوار ہو۔
اور چھوٹی سی بنّوں کو لے کے محلوں میں آئے"

اور پھر منظر لڑکی والوں کے ہاں پہنچ گیا ـــــ پورن دئی نے سہاگ

شروع کیے، رانی کے باپ کو خطاب کرتے ہوئے:

"بابل تجھے نیند پیاری ہے؟

ارے گھر میں کنیا کنواری ہے

سندر بیٹی تیری بر مانگتی ہے، ور مانگتی ہے، اچھا سا گھر

مانگتی ہے۔"

اوپر کسی نے مٹھی گول کر کے باجے کی سی آواز نکال دی۔ بس پھر کیا تھا سب سمجھ گئے، برات آگئی۔ خوب، خوب دھما چوکڑی مچی۔ گاؤں کے سب بوڑھے، بچے، مرد، عورتیں سامنے کے کھلے میدان میں، کنویں کے من پر، کوٹھوں کی چھت پر، درختوں کے اوپر، یہاں، وہاں سب جگہ پہنچکر بیٹھ گئے۔ پورن دئی، اور اُس کی طرار ساتھن ودیا نے برات کی طرف اشارہ کر کے آئے ہوئے مہمانوں کو بندر، سؤر، بھیڑیے اور نہ جانے کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اُٹھا دیے جس پر خوب ہی کھلّی پڑی۔ سمدھنیاں ناچیں، ڈومنیاں تھرکیں

جب ہی پورن دئی نے اپنی باہنہ اُلاری، اور وہ نظارہ گاؤں کے لوگ آج تک نہیں بھولے، کیوں کہ چولی کے نیچے سے پورو کی ولایتی انگیا نے آنکھیں ماری تھیں۔ پھر اُس نے ودیا کے ساتھ مل کر کئی نمکین اور رسیلی سٹھنیاں دی تھیں:

پودینے کی کرو کڑھائی رے۔
منگل کی ماں، رنڈی کی بیٹی آئی رے۔
ہمارا اچھا کرارا پودینہ!"

اِس پر نواب کی بیوی عائشہ، جہلم ارائین اور اُس کی تینوں بیٹیاں عائشہ، عنایتی اور سلامتی بھی شامل ہو گئیں۔ جیسے پودینہ صرف انہی کی ملکیت تھی۔ اور سب ناچ ناچ اُٹھیں:

"ہمارا اچھا کرارا پودینہ
مصالحوں والا پودینہ
منگل کی بہن تھانے داروں سے چھڑائی رے۔
پودینے کی کرو کڑھائی رے"

پھر ہنسی، کھیل، کلکاریاں، جن میں مرد بھی شامل ہو گئے، بچے بھی اور بوڑھے بھی۔ کون کس کی چوٹی کھینچ رہا تھا اور کون کس کو کلاوے میں لے رہا تھا، یہ کسی کو پتہ نہ چلا ——— پورن دئی جمالے کی باہوں میں پڑی تھی اور وہیں مچل مچل گئی۔ ددّیا مرد پو کو لپٹ لپٹ رہی تھی۔ بڑی نیچے آکر جو کھڑی ہوئی، تو اُسے کسی طرف سے دھکا پڑا اور آنکھ گیان چند کی جانگھوں میں جا کھُلی۔ جو اُسے بڑے پیار، بڑی ہی شفقت سے بھینچ رہا تھا۔

جب ہی چادر کھینچی اور شادی ہو گئی ... ایکا ایکی

سب خاموش کھڑے ہو گئے، کیوں کہ ڈولی رخصت ہونے کا سمے آگیا تھا۔

مائیکے والیوں نے گانا شروع کر دیا:

"بابُل! اب تیرا کیا دعوے ہے؟
دولہا کا باپ ڈولی کی مُنیاں پکڑے کھڑا ہے ــــ
ــــ اب دعویٰ اُس کا!

بھیّا! اب تیرا کیا دعویٰ ہے؟
دولہا کا بھائی ڈولی کے بازو تھامے کھڑا ہے ــــ
ــــ اب دعویٰ اُس کا!"

اور پھر ایک واحد بین لڑکی کا:

"بابل! طاقچوں میں میری گڑیاں بکھری ہیں، لیکن مجھے
کھیلنے کا چاؤ نہیں
بابل! انگ سہیلیاں، یہاں وہاں مجھ سے ملنے آئی ہیں
لیکن مجھے ان سے بھی ملنے کا چاؤ نہیں!
ہائے روتی ماں کی انگیا سج گئی، اور باپ تو دریا رو
رہا ہے۔"

پھر مُنہ دکھائی اور جگ ہنسائی، آخر سر جوڑی!

پہلے رانو کو اور پھر منگل کو پکڑ کر کوٹھڑی میں دھکیلتے ہوئے باہر سے تالا لگا دیا گیا، جسے چمپوں، دونوں جڑواں بھائی، اور بڑی دیکھ رہے تھے اور اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے۔

---

(۷)

اُس رات رانو، ایک بہن، بیوی اور ماں کی طرح منگل کے زخموں پر سینک کرتی رہی ——— باہر تو جا نہ سکتی تھی، اِس لئے وہیں ڈوپٹے کو مُنہ میں ٹھونس کر، وہ اُس میں اپنے گرم گرم سانس کی دھونکنی چلاتی اور منگل کی سوجن پہ رکھ دیتی۔ اُسے آرام بھی آرہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ کراہ بھی رہا تھا کبھی کبھی درد بغیر بتا دیے، بنا خبردار کیے، شعور کی تہوں میں کہیں گُم ہو جاتا تو منگل کو رانو کے ہاتھ عجیب سے لگنے لگتے۔ شاید اِن ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی کا رنگ اُس اندھیرے سے بھی تیکھا تھا، اور بو اُس کھٹے سے بھی تیز، جو

سردی اور گرمی کے ملاپ سے ایک دم مہک اُٹھتا ہے اور پھر دل میں ایک عجیب طرح کی اَن کہی، آنکھ میں عجیب طرح کے ان بہے چھوڑ کر، چند ہی دنوں میں، پت جھڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔

رانو، یکسر بھول چلی تھی، اُس کے بچے کہاں ہیں؟ کیسے سوئے ہیں؟ اُن میں سے کسی نے کچھ پیٹ میں ڈالا بھی ہے، یا نہیں؟ ـــــ ایک بار جموں کی شبیہہ لپک کر اُس کی سوچ میں آئی، اور پھر ویسے ہی اپنے آپ چلی گئی ـــــ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ جموں سے کہیں بالا تھا۔ جموں اور اُس کے ساتھ کے لاکھوں کروڑوں بالک اُس کا ایک حصہ تھے اور بس ـــــ کبھی بیچ میں منگل بدک کر پہلو موڑ لیتا تھا۔ پھر رانو ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی اور دبی دبی سسکیاں لینے لگتی، جو تخلیق سے پہلے ہر عورت کا مقدر ہوتی ہیں ـــــ ایکا ایکی اُسے پیاس لگی، لیکن کھڑکی کھول کر کسی کو پانی کیلئے کہنے کی ہمت نہ ہوئی ـــــ پھر منگل بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ـــــ ایکا ایکی اُس پر پاگل پن کا کوئی چکر آیا۔ اور دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا رہا سہا کرتا بھی پھاڑ ڈالا۔

"میں مر گئی ـــــ" رانو چلائی اور اُس کے پاس چلی آئی۔

"پرے ہٹ جا" منگل نے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

پچھلی رات رانو نے منگل کے پاؤں پکڑ لئے اور اُن پر سر رکھتی، روتی ہوئی بولی:

"تو تو جانتا ہے منگلا! اِس میں میرا کوئی قصور نہیں"

منگل جواب تک مضمحل ہو چکا تھا بولا ——

"جانتا ہوں"

اور پھر نہ جانے کس جذبے سے اُس نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھتے رہنے اُسے پتا پتا، سوئی سوئی دکھائی دینے لگی تھی۔

رانو نے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے، دیکھنے لگی کہ اُس کی تقدیر کا ساتھی اگلے لمحے، اِس مہندی رچے ہاتھ کو اپنے کرخت، چھانٹے والے ہاتھوں میں رہنے دیتا ہے، یا جھٹک دیتا ہے؟ —— لیکن ایسا تو کچھ بھی نہ ہوا۔ منگل کا ہاتھ جیسے اپنے آپ نیچے گر گیا اور ساتھ رانو کا بھی —— باہر لوگ ہمیشہ کی طرح یہی سمجھتے رہے، شادی ایک مسلسل شبِ زفاف کے سوا کچھ بھی نہیں —— کچھ لوگ تو ہیرے ہی سے نہ جانتے تھے، اور جو جانتے تھے، وہ اُن لمحوں کو بھول چکے تھے، جو اُن پر بھی آئے تھے۔ جو تپیدگی اور ہیجان اور اہتزاز دونوں کے بیچ میں پیدا ہوا

تھا، شبِ زفاف کی لذّت اُس کے مقابلہ پہ ایسی ہی تھی، جیسے کوئی مفروضہ حاتم سے مہریں مانگنے جائے، اپنے ساتھ پوری انسانیت، اور اُس کے وقار کو اُس کے قدموں پہ جا گرائے اور [illegible] کے عوض میں ایک دمڑی پائے، اِس پر بھی دُعائیں دیتا ہوا گھر چلا آئے۔

صبح جب رانو اور منگل جاگے تو کسی نے تالا کھول دیا تھا ــــ منگل اُٹھا ــــ اُس نے چلنے کی کوشش کی لیکن دو ہی قدم کے بعد کراہتا ہوا لوٹ آیا۔ اور روتے ہوئے اپنے عروسی بستر پہ گر گیا ــــ رانو بھاگ کر باہر پہنچی اور جا کر ماں جنداں کے پاس کھڑی ہو گئی ــــ

"کیا ہے بہو؟" جنداں بولی۔

اِس پر رانو نے کہا: ــــ "بھنڈارے کی چابی دو ماں!"

"وہ کس لئے؟"

"ہلدی نکالنا ہے، اُسے بہت مار لگی ہے"

جنداں نے اپنے دوپٹے کے پلّو سے چابیاں کھول کر رانو کو دے دیں۔

بھنڈارے کی طرف جانے کی بجائے رانو برآمدے کی طرف لپکی، جہاں بچے آدھے ننگے، آدھے ڈھکے ہوئے سو رہے تھے۔ رانی نے باری باری سب کا منہ چوما اور اُن کے بازوؤں، ٹانگوں میں

اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر اُن کے جسموں کو ڈھانپا ــــــــ گلابی سی سردی سے ہاتھ رانوں میں دیئے، سکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونے شروع ہوئے۔ لیکن رانو جب بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی ــــــــ اِس سے پہلے کہ رانو اُس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ــــ بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منہ نوچ لیا اور بولی:

"جا تو اُسی سے منہ کالا کروا!"

رانو پر پہلے ہی کیا کم گزری تھی کہ اس پر بیٹی نے منہ نوچ لیا! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی ــــــــ "بیٹی! تیرے ہی لئے تو میں نے یہ سب کیا ہے۔ اور تو اور ــــــــ تو بھی ــ!؟" ــــــــ لیکن اُس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی اُس کی بیٹی، اُس کی اپنی بیٹی، جسے اُس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا ــــــــ ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جانکنی کے عالم میں اس دُنیا میں لائی۔ بے بسی اور میلے سے دھوتی، روتی ہوئی پالا، بڑا کیا اور اب بڑی ہو کر اُس نے منہ نہیں نوچا، پھول برسائے ہیں!

رانی ایک خالی اور کند ذہن کے ساتھ اندر ہلدی لینے چلی گئی، جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر توے پہ پکایا اور پھر منگل کی چوٹوں پر باندھنے

کے لئے لے چلی ـــــ اندر پہنچی تو منگل وہاں نہ تھا ـــــ شاید جب رانو اپنی ساس کے پاس تھی، وہ کہیں نکل گیا تھا۔ رانو دوڑ کر باہر دروازے تک گئی۔ منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا۔ البتہ ڈبو پاس آکر دُم ہلانے، چوں چوں کرنے لگا اور اگلے پنجے اُٹھا اُٹھا رانو پہ رکھنے لگا ـــــ جیسے کہہ رہا ہو۔

"میں جانتا ہوں رانی! تیرے ساتھ کیا ہوا؟ سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ آخر سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ"

چنّوں روز سویرے مندر جایا کرتی تھی اور صبح کی دودھیا خنکی پہ اُس کی آواز پیرتی ہوئی آیا کرتی:

"منّاں! تیں رام نہ جانیار ے!"

لیکن آج مندر جانے کے بجائے وہ سیدھی رانو کے ہاں چلی آئی ـــــ رانی بھی اُسے دروازہ میں کھڑی مل گئی ـــــ چھوٹتے ہی چنّوں نے پوچھا:

"کیوں رانی! سب سُکھ ہے نا؟"

رانی چپ رہی ـــــ

"بول نا" ـــــ چنّوں پوچھنے لگی ـــــ اِس پر بھی رانی کچھ نہ بولی تو چنّوں نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ـــــ "بول، رات کچھ ہوا؟ ہائے کیسی گھنگھنیاں مُنہ میں ڈالی ہیں؟"

جو گھنگھنیاں رانو نے مُنہ میں ڈالی تھیں، اُن کے بارے

میں کیسے بتاتی ؟ اِس کھولتے پانی کی تپش اور جلن میں اُس کے جذبات، اُن کی کاشت اور حاصل برداشت کا دانہ دانہ تک اُبل گیا تھا، جل گیا تھا، چنّوں کو کن الفاظ میں بیان کرتی ؟ نیچے دیکھتی پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رانی بولی :

"رات کچھ نہیں ہوا "

چنّوں نے غور سے رانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی :

"جھوٹ بکتی ہے ؟ ہلا (اچھا) تیرے منہ پر یہ ناخنوں کے نشان کیسے ہیں ؟"

ٹھنڈے پسینے کے قطرے رانو کے چہرے پہ چلے آئے اور وہ کچھ نہ بولی ـــــ کچھ دیر یوں ہی بیکار، شرمسار سی کھڑی رہنے کے بعد جیسے وہ ایکا ایکی اُبل پڑی ـــــ

"تو جو کہتی ہے، چنّوں، مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ میں تو تن ڈھلنپنے کے لئے دو کپڑے مانگتی تھی، بھیناں، پیٹ نیں ڈالنے کیلئے دو روٹیاں ـــــ پتا نہیں واہگورو، پرماتما کو کیا منظور ہے ؟ دیوی ماں کیا چاہتی ہے ؟ وہ اب پھر چلا گیا ہے کہیں "

"ہائے رام !" چنّوں نے پیچھے گلی کے اندھیرے کو صاف ہوتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی۔ "کدھر گیا موا، تت پلتّا ؟" اور پھر

ایک دم کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بولی ـــــ "میں منہ جلی، تیرے سامنے تو اب مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیئے۔"

رانو مسکرا دی ـــــ جیسے رو رہی تھی، یا رو دی ـــــ جیسے مسکرا رہی تھی،

چنوں رانو کو دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی ـــــ "اس کی تو فکر نہ کر، رانو! جیسے وہ گیا ہے، بیبا! ویسے ہی آ بھی جائے گا"

اور دوپہر کے قریب منگل سچ مچ ہی چلا آیا۔ اُس نے نواب کا کُرتا پہنا ہوا تھا، اسمٰعیل کا صافہ اور گوردداس کا گلابی شاہی جوتا ـــــ بدن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اُس کا خیال تھا، گھر کی ہلدی ولدی سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں، اِس لئے وہ صبح کے پہلے ہی پھیرے میں اسمٰعیل کے ساتھ اُس کے اِکّے پر نکل گیا تھا اور ڈسکہ کے بڑے اسپتال میں جا کر پٹی کروا آیا تھا۔ صبح سے پیٹ میں کچھ ڈالا تھا یا نہیں، خدا جانے ـــــ کل سے تو صرف مار کھائی تھی اور یا پھر شادی کی تھی!

دن بھر منگل کھاٹ پر بیٹھا زمین کے تنکے گنتا رہا ـــــ کبھی دھیان میں، اپنا آپا اُسے ایک تنکے سے بھی ہلکا معلوم ہونے لگتا، اور کبھی پوری زمین سے بھاری ـــــ پھر کبھی بیچ میں جھک کر، انگلی سے وہ کچی زمین پہ "او دنیاں" ـ قسمت کی لکیریں کھینچنے لگتا، لیکن جب

اُنہیں گنتا تو وہ جفت ہی آتیں، کوئی طاق نہ بچتی ـــــــ قسمت کہیں راستہ نہ دیتی ـــ جھلا کر ہاتھ جھٹکتے ہوئے اُس نے اپنے بھاگوں کے سب لیکھ مٹا دیئے اور اُٹھ کھڑا ہوا ـــ ایک اضطراری کیفیت سے چہرہ صاف کیا تو دھول منہ پر چلی آئی۔ اپنی طرف سے صفائی کے عمل میں وہ اور بھی گندہ تقدیر آلود نظر آنے لگا تھا۔

جب ہی ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر وہ بکائن پر آکر بیٹھنے والے، کرخت آواز میں کائیں کائیں کرنے والے ڈھوڈروں، پہاڑی کوؤں کو اُڑانے، گاؤں کے گولی جو گے آوارہ کتوں کو ایک نیم جاں، خارش زدہ کُتے پر جھپٹنے سے روکنے لگا۔ پھر ایک طرف سے کہیں آدھی درجن کے قریب کُتے، ایک دوسرے پر جھپٹتے، غراتے ہوئے چلے آئے، جنہیں بھگاتے ہوئے منگل بول اُٹھا:

"میں حیران ہوں یار! کوٹلے میں جو بھی مرتا ہے، شاید کُتا ہی بن جاتا ہے۔"

کچی دیوار پر سے دور دھولا دھار اور ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے اور ان کے بیچ میں کہیں کہیں برف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی ـــــ ان پہاڑوں سے اِدھر دکن کا وہ علاقہ تھا، جس کی ٹیکریوں پہ پہاڑی کے سوز نے جنم لیا تھا، کیوں کہ یہاں کے

عاشق اور معشوق کبھی آپس میں نہ مل سکے تھے۔ ایک اُس ٹیکری پہ ہوتا تو دوسرا اُس پر اور بیچ میں دریا ــــــ

پاپی لوگ پہاڑ دے، پتھر جن کے چِت
انگ ملاوا کبھی کبھی، نین ملاوا نِت

اور اُن کی جُدائیوں کا درد، راوی، چناب اور جہلم کے کنارے کنارے ہوتا ہوا وارث شاہ اور قادر یار کی صورت میں ساندل اور گنجی بار کے دل تک پہنچ گیا تھا۔

ایک ایک کر کے گذرے ہوئے واقعات منگل کے دماغ میں آنے لگے۔ اُس نے ایک سرد آہ بھری اور مرزے کی آواز میں گنگنانے لگا:

"تو نے بُرا کیا صاحباں! جو میری بکی کی اگاڑی باندھ دی ــــــ میرے تیر و ترکش ٹانگ دئے، ورنہ ایک تیر سے تیرے بھائیوں کو کھیت کر دیتا اور دوسرے سے اُسے، جس کی تو منگیتر تھی۔"

لیکن، شاید، منگل کے فگار دل کے لئے مرزا صاحباں کا وہ حصہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر، دوسری بانہہ الارتے ہوئے وہ گانے لگا:

"مجرے شاہ فقیر سے ایک جاٹنی عرض کرتی ہے: ــــ میں

سالم بکرا تیری نیاز گذاروں، اگر میرے سر کا سائیں مرجائے
ــــ پانچ سات پڑوسنیں ہلاک ہو جائیں اور جو رہتی ہیں انہیں
تپ آلے ــــ گاؤں کے نمبردار کو ٹکی پڑے جو تھانے
میں رپٹ کرتا ہے ــــ کراڑ، بنیئے کی ہاٹ جل جائے جہاں
ہمیشہ دیا جلتا ہے ــــ فقیر کی کتیا مر جائے جو دن رات
چوں چوں کرتی رہتی ہے ــــ گلیاں سونی ہو جائیں ــــ
اور میرا محبوب بنا روک ٹوک کے آسکے ــــ "

یوں جی کو آسودہ کر کے منگل اندر جا کر لیٹ گیا ــــ جب تک فضاؤں سے گشت وخون نکل گیا تھا۔ صبحیں، دوپہریں اور شامیں ڈھلنے لگیں، جیسے وہ کوئی میلی دیواریں تھیں، اور کوئی آسمان کے دریائے درد سے مٹکوں پانی لے کر، کرنوں کی جھاڑو سے انہیں دھو گال رہا تھا۔

رانو نے کھانا پکایا۔ پھر بھاگ کر جنتوں کے ہاں سے تھوڑا سا گھی لے آئی اور ایک بیوی کی طرح، اس کی بڑی سی مقدار روٹی پر رکھ دی ــــ وہ روٹی پہ "چونگھا" نکالنے ہی والی تھی کہ کسی خیال کے آنے سے رک گئی، شرما گئی اور ہاتھ کھینچ لیا۔

کچھ دیر میں کھانا ڈالنے کے بعد اس نے بڑی سے کہا:

"جا، اسے دے آ"

بڑی نے نتھنے پھُلاکر شانے جھٹک دیے اور بولی ـــــ
"میری جاتی ہے جوتی !"
رانو خجل ہو کر خود ہی اُٹھنے والی تھی کہ پاس بیٹھا ہوا جموں بول اُٹھا ـــــ "لا ماں! میں دے آتا ہوں۔"
رانو نے جموں کی طرف دیکھا، جیسے یہ اُس کا بچپن تھا، اُسکی معصومیت ہی تھی، جو رانو کے دُکھ کو سمجھ سکتی تھی ـــــ یہ بچپن، اور معصومیت جو کردہ و ناکردہ گناہوں سے کہیں دیر تھے ـــــ رانو کا جی چاہا، اُسے چھاتی سے لگا لے ـــــ بھینچ لے، یوں نہ بھینچ لے کہ وہ پھر سے اُس کے بدن میں تحلیل ہو جائے اور اس دُنیا میں نہ آئے، جہاں....
جب ہی اُس نے تھالی جموں کے آگے سرکا دی، اور خود دوپٹے میں مُنہ چھُپا کر رونے بیٹھ گئی۔
یوں دن بیت گئے ـــــ مہینے بیت گئے ـــــ
منگل کے دل میں آہستہ آہستہ ایک ذمہ داری کا احساس جیسے اپنے آپ پیدا ہونے لگا اور وہ چار چار، پانچ پانچ روپے کما کر گھر لانے لگا۔ اگرچہ رانو کے ساتھ اُس کا میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا، اس پر بھی وہ روپے لاکر، ماں کے ہاتھ میں دینے کی بجائے رانو ہی کے ہاتھ میں دیتا اور رانو خوش ہو اُٹھتی اور اُداس بھی ـــــ ڈر سے بِلا جُلا

ایک استحکام کا جذبہ اُس کے دل میں جگہ پانے لگا ـــــ گاؤں بھر کی عورتیں، کیا چنّوں اور کیا پورن دئی، کیا وِدّیا اور کیا سروپ، سب نے کچھ ہوا نی ـــــ کچھ ہوا ؟" پوچھ پوچھ کر غریب رانو کا ناک میں دم کر دیا تھا ـــــ رانو جواب میں صرف اتنا ہی کہتی ـــــ "رنڈیو! شکر نہیں کرتیں، میرا گھر بس گیا ہے؟ ـــــ روٹی کپڑا ملنے لگا ہے مجھے ؟ ـــــ اب مجھے کوئی اِس گھر سے نہیں نکالے گا ـــــ کوئی میری بیٹی کو نہیں بیچے گا۔"

لیکن وہ سب شہد کی مکھیاں یوں ہی چھوڑنے والی تھوڑے تھیں ؟ دیر تک وہ رانو کے اِرد گرد بھنبھناتی رہتیں اور کولہوں میں چبھے دے دے کر پوچھتیں :

"کیا مطلب ـــــ ؟ ساری رات وہ یوں ہی پڑا رہتا ہے؟"

"ہاں"

"تو اِدھر اُدھر وہ اُدھر؟"

"ہاں"

"تو بھی اُسے بُلانے کی کوشش نہیں کرتی ؟"

"نہیں"

"کیوں نہیں ؟ ـــــ ناس پیٹیے! وہ تیرا وہ ہے ـــــ

شادی کی ہے تیرے ساتھ، چادر ڈالی ہے تجھ پر"

رانی رو نکھی ہو اُٹھتی اور بول اُٹھتی:

"چادر ڈالی ہے تو کیا ہوا؟ ____ مجھے اب بھی وہ ویسا ہی لگتا ہے، جیسا پہلے لگتا تھا"

اِس پر سب ہنکار اُٹھتیں ____ "ہو، ہائے!" ____

"پھٹے مُنہ" ____ "دُر لعنت" ____ اور پھر وہی ____ "تمہیں نیند کیسے آتی ہے؟"

"جیسے پہلے آتی تھی"

"وہ بھی سو جاتا ہے بس ایسے ہی؟"

"ہاں"

"رات کو اُٹھتا، اکڑتا، جماہی بھی نہیں لیتا؟"

اِس پر سب ہنس پڑتیں اور ایک دوسرے کو "چھبیاں" دیتے لگتیں اور آخر سمجھاتیں:

"تو کچھ کر، گشتی جمانے کی، نہیں وہ ہاتھ سے جاتا رہے گا"

پورو بیچ میں بول اُٹھتی ____ "کہو تو تجھے ایک ٹونا لا دوں؟"

"ہاں نی" ——— وِدیا حامی بھرتی۔

"نہیں نہیں" ——— رانو کہتی ——— "میں کوئی ٹونا دونا نہ کروں گی۔"

"تو پھر بیٹھ کے روئے گی" ——— پورو تنبیہاً کہتی۔

وِدیا معنی خیز انداز میں پورو کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھتی

"تُو تو نہیں روتی نا؟"

پورو ایک دم اپنی شرم اور لاج کو ایک طرف رکھتی، اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی ——— "میری روتی ہے یہ۔ میں ٹوٹکا نہ لاتی، میرا شمبھو پیدا نہ ہوتا تو یہی چاچا تمہارا مجھے گھر سے نکال دیتا، ہاں۔"

اس پر سب کھلی کپاس کی طرح ہنس ہنس پڑتیں، اور پورن دئی ایک بڑی سی آنکھ پھیلا کر، سب کو چاروں طرف دکھا کر مارتی ——— لٹ پہ جیتوں پوچھ لیتی:

"باوا ہری داس کے کتنے دن رہ گئے؟"

جب ہی پورن دئی جیتوں کی چوٹی پکڑ کر یوں کھینچتی کہ سب "میں مرگئی، ہائے میں مرگئی" کے ٹکڑے میں ختم ہو جاتا۔

اُدھر نصیبوں والے اڈے پر گوردھن داس، نواب اور اسمٰعیل

منگل کی جان نہ چھوڑتے اور اکثر پوچھتے رہتے :

"کیوں، پھر کیسی لگی ــــــ ؟"

اور منگل کا چہرہ ایک دم لال ہو اُٹھتا ! ۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے اُس کی ماں بہن کے بارے میں کوئی بات بے احتیاطی سے کہہ دی ہو۔ وہ چُپ رہتا اور بیکار ہی کے ساز میں بکلس کسنے، یا گھوڑی کو تھپکنے لگتا۔ گورداس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا۔

"سچ پوچھو تو "دوہاجن" کی بڑی موج ہوتی ہے"

"موج کیسی ؟" نواب لقمہ دیتا، یا اسمٰعیل، یا کوئی اور۔

"وہ پہلے ہی رسی لبی ہوتی ہے نا ! سب جانتی ہے۔"

اِس پر سب مل کر ہاہا، ہوہو کرنے لگتے ــــــ جس کے بیچ میں منگل کی پاٹ دار آواز آتی ــــــ

"ٹھہرو، تمہاری ماں کا یا..."

اور سب ایکا ایکی چپ ہو کر منگل کی طرف دیکھنے لگتے۔ صرف گورداس ہمّت کرتا، کیوں کہ وہ تن و توش کے اعتبار سے مضبوط تھا، اور اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر کسی کو سوچنا پڑتا تھا۔ وہ کہتا :

"اُسے ماں بنانے کیلئے بیاہ کیا ہے، اوے ــــــ چادر ڈالی ہے اُسپہ ؟"

منگل ایک کڑی نگاہ سے اُس کی طرف دیکھتا لیکن مصلحت کو بہادری سمجھ کر چُپ رہتا ـــــــ تھوڑی دیر میں گد لائی ہوئی فضا صاف ہوتی اور اسمعیل کوئی لطیفہ شروع کر دیتا یا کثیفہ :

"ایک سردار جی کی اکنّی کیچڑ میں گر گئی ہے"ـــــ

"پھر، پھر کیا ہوا ؟"ـــ نواب منگل کی طرف دیکھتے، مزا لیتے ہوئے پوچھتا، جب ہی بیچ میں کوئی سواری چلی آتی اور نواب اُس سے مخاطب ہو جاتا ـــــ "کوٹلے چلے گی مائی ؟"

"نہئیں ویرا ـــــ" مائی کہتی اور چلی جاتی ـ نواب پھر اسمٰعیل کو پکڑتا ـــــ "ہاں تو سردار جی، کی اکنّی کیچڑ میں گر گئی ؟"ـــــ

"ہاں ـــــ" وہ بیان جاری رکھتا ـــــ "اور وہ کچھا پہنے ہوئے کیچڑ میں کود پڑے، اور لگے اکنّی ڈھونڈھنے اور اوپر ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کہنے ـــــ اللہ مل جائے، یا اللہ مل جائے۔ ایک مُسلمین پاس سے گزرا ـــــ اللہ کا نام سُن کر ٹھہر گیا، اور بولا ـــــ اوئے سردارا ! تو ہمارے اللہ سے کیوں کہتا ہے ؟ اپنے واہگورو سے کیوں نہیں ؟ ـــــ سردار جی نے اوپر دیکھا اور بولے ـــــ اونہہ ! اِکنّی کیلئے واہگورو کو کیچڑ میں ڈالوں ؟ـــــ"

اِس پر سب کھلّی مار کے ہنس دیتے ـــــ منگل بھی مسکرا اُٹھتا

اور اسمٰعیل اُسے اجازت نامہ سمجھ کر اُس کے پاس پہنچتا اور کہتا:

"منگلا! یہ ٹھیک ہے، سرداروں کے بارہ بجتے ہیں؟"

"ہاں، بجتے ہیں ــــ" منگل اقرار کرتا۔

"تیرے بھی بجتے ہیں؟"

"ہاں میرے بھی بجتے ہیں"

پھر منگل کے "جونڈے" پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسمٰعیل پوچھتا:

"یہاں کچھ ہوتا ہے؟"

"ہاں ہوتا ہے" ــــ منگل پیچھا چھڑانے کے لئے مان لیتا۔

لیکن اسمٰعیل اِسی پر بس نہ کرتا ــــ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ــــ "سُن!..... یہ تمہیں دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے، یا رات کے بارہ بجے بھی!؟"

"دن کے ــ جو اصلی سکھ ہے، اُسے تو دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے۔ اتنے بال اور گرمی کتنی پڑتی ہے۔"

"تو پھر؟" اسمٰعیل کہتا ــ "وہ اپنے گاؤں کا وساکھا سنگھ ہے نا ترکھان وہ تو رات کے بارہ بجے بہت "کھروو" کرتا، شور مچاتا ہے۔"

منگل جواب دیتا ــ "وہ حرامجادہ جرور سامان سے سکھ ہوا ہوگا..."

اور سب مل کر ہنسنے لگتے۔ منگل کی آواز سب سے بلند ہوتی۔ پھر بیچ میں کوئی جاترن چلی آتی اور سب مل کر اُسے لپک لیتے۔ اُس کی گٹھڑی نواب کے اِکّے میں ہوتی، جوتے منگل کے اِکّے میں، اور وہ خود گوردا س کی باہنوں میں ـــــ اکثر ایسا ہوتا، میاں ایک اِکّے میں ہوتا اور بیوی دوسرے میں اور بچّہ تیسرے میں ـــــ پھر بہت سی گالی گلوچ کے بعد سب مل کر کسی ایک کا اِکّا بھر کر روانہ کر دیتے اور خود دوسری سواریوں کے پیچھے بھاگنے لگتے ـــــ منگل کو اب عورتوں میں صرف سواری کی حد تک دلچسپی تھی وہ کبھی کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا بھی، تو ایک سرسری نظر سے، جیسے کہہ رہا ہو، ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں ـــــ سلامتے میں اسے اب بھی دلچسپی تھی ـــــ اس لڑکی کو عورتوں کی ڈاک سے پتہ چل گیا تھا کہ منگل اور اُس کی بیوی میں ابھی تک کچھ وہ نہیں ہوا ـــــ وہ اور بن سنور کر اُس کے سامنے آتی اور سیروں کے اشارے کرتی۔ لیکن اندر سے وہ جلی بیٹھی تھی۔ اُس نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ ایک دن منگل کو اپنے چنگل میں پھنساؤں گی۔ ڈھلے کے پیچھے کپڑے اُتر واؤں گی اور جب وہ ہاتھ بڑھائے گا تو شور مچا دوں گی، اور اُس کی وہ بے عزتی کراؤں گی کہ یاد ہی کرے۔ اب جبکہ وہ بیوی والا ہو چکا ہے، اُس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے کالا ہو جائیگا۔

اُس دن نصیبوں والے اڈے پہ منگل نے نواب کے ساتھ

پی لی لیکن ڈرتے ڈرتے ـــــ اپنے بھائی کے زمانہ میں تو وہ بوتلیں لنڈھایا کرتا تھا لیکن اب وہ ڈرتا تھا ـــــ اسے پینے کی خواہش تھی لیکن یوں بے تکے پن سے نہیں۔

رانو بھی عام عورتوں کی طرح تھی، جو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنے شوہروں کے چہرے دیکھنا سیکھ جاتی ہیں اور اُس پر آنے والے ایک ایک شکن کو جاننے پہچاننے لگتی ہیں، جب اُن کا مرد کوئی گناہ کر کے آتا ہے تو اُنہیں لامحالہ پتہ چل جاتا ہے ـــــ یہ الگ بات ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتیں ـــــ باتیں کرنے میں وہ اُن کی زیروزبر دیکھ لیتی ہیں۔ بلکہ چوکھٹ کے اندر اُن کا پہلا ہی قدم اُن کی پوری جاتک، پوری الف لیلےٰ اُن کے سامنے دوہرا دیتا ہے۔

اِس سے پہلے بھی منگل نے دو چار بار پی لی تھی اور وہ جان گئی تھی۔ منگل کو بھی معلوم تھا کہ وہ جان گئی ہے لیکن اس پر بھی خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور ایسے ہی نبھتی رہی۔

جوں جوں دن بیتنے لگے، گاؤں کی عورتیں، رانو کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں ـــــ اور وہ سوچنے لگی، شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں۔ وہ ڈرنے لگی، اپنے مستقبل سے، اپنے بچّوں کے مستقبل سے، کیوں کہ بیچ بیچ میں منگل الف ہو اُٹھتا تھا: ـــــ "ہٹاؤ یہ سب ـــــ کیا تماشہ بنا رکھا ہے؟

اور رانو کانپ جاتی وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی اُس پر اُس کا حق ہی کیا تھا؟ نہیں نہیں حق تو تھا۔ پنچایت کی موجودگی میں، گاؤں کے سب مردوں عورتوں کی گواہی میں، اُس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی۔ سوچیں تو حق بھی ہے۔ اور نہیں بھی۔ چادر کا کیا ہے؟ ـــــ اڑھائی تین گز کا کپڑا! ـــ ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں؟ ـــــ یہ سب ٹھیک ہے۔ نہیں، کچھ بھی ٹھیک نہیں ـــــ تلوکا بھی تو تھا، اُس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی۔ جو منہ میں آتا، دھڑلے سے کہہ ڈالتی، چاہے بعد میں مار ہی کھاتی میں اِسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی؟

منگل رانو پر اُنگلی بھی نہ اُٹھاتا تھا سوائے رات کے اُس جگہ پر کھڑا بھی نہ ہوتا، جہاں رانو کی پرچھائیں پڑتی ـــــ پھر بھی اِس کا کیا مطلب؟ چلو اچھا ہی ہے، مار تو نہیں پڑتی، ہڈیوں کو سینک تو نہیں کرنا پڑتا، لیکن ... بہت دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد رانو سمجھ گئی کہ وہ منگل کو کیوں کچھ نہیں کہہ سکتی؟ دوسری عورتیں جو اناپ شناپ منہ میں آئے بک دیتی ہیں ـــ دن چھلّا رات زیور کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں، اور اُسے لا کے دینا ہی پڑتا ہے ـــــ

آج دن کچھ اندر باہر تھا، جب منگل قصبے سے لوٹا ـــــ سورج

کی روشنی ابھی آسمان پر ہونے سے اشٹمی کا بے نور چاند سفید سی پتنگ کی طرح ایک کسیکر میں اُلجھا ہوا تھا اور اب اِکّے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا ساہنسیوں کی ٹھٹّی کے اوپر، آسمان کے کھُلے میدان میں جا کر ساکت ہو گیا جہاں منگل اپنا اِکّا رکھ دیا کرتا تھا اور یکّی کو تھوڑا سا چارہ وارہ ڈال کر گھر چلا آتا ـــــ پھر لوٹ آنے، اُسے کھریرا کرنے اور دانہ ڈالنے کے لئے ـــــ باقی کا کام اگلی سویر پہ ملتوی ۔

اِکّا اور یکّی کا بندوبست کرنے کے بعد منگل لوٹا ـــ جہاں وہ اِکّا کھڑا کیا کرتا تھا، وہاں سے دائیں طرف فارم کی پندرہ پندرہ فٹ اونچی ایکھ کھڑی تھی جس کے بیچ میں سے چیونٹی بھی نہ گزر سکتی تھی۔ البتہ جھینگر اپنی ہی دُھن میں سے دن بھر لیں نکال کر ایک تار سا بناتے اور جھولتے جھُلاتے ایک گنّے سے دوسرے گنّے تک پہنچ جاتے اور پھر اُس کے رس میں ڈوب کر اگلے گنّے کے پاس ـــــ بائیں طرف مکان شروع ہوتے تھے، جنمیں سب سے اِدھر مدرسہ تھا اور اُس کے ساتھ والا مکان جہلم ارائین کا ـــ جس کے اُدھر جا کر اب چاند تھم گیا تھا۔

فضا میں سے ایک قسم کی خوشبو آ رہی تھی ـــــ منگل جانتا تھا وہ خوشبو کیسی ہے؟ ـــــ بات یہ تھی گاؤں کے کسان ہر سال اِسی مہینے رس نکالتے، گُڑ بناتے اور ایکھ کے بیچ میں تھوڑی سی جگہ خالی کر کے، زمین

کھود کے، گڑ سے بھرا ہوا مٹکا اس میں رکھ دیتے اور کیکر کی چھال اُس میں ڈالکر

اوپر گوبر اور گھوڑے کی لید ڈال دیتے ــــ کچھ دن میں مٹکا "چلنے" بولنے

لگتا اور بڑ بڑ کرتی ہوئی شراب مٹکوں سے باہر چلی آتی، ہوائیں بس جاتی۔

فضا مکدر ہو اُٹھتی اور معطر بھی۔

اب بھادوں اسوج میں ڈھل رہا تھا، جب کہ گرم ہوا اور

لُو کے عادی جسم سرد ہوا کا ایک بھی جھونکا برداشت نہیں کرتے۔ عجیب طرح

کی چُبھن انسان کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے۔ نہ وہ انسان چادر اوڑھ سکتا ہے

نہ چھوڑ سکتا ہے...... عورتیں کسی خیالی کیکپی سے اثر پذیر ہو کر سب گودڑ اور

روئی اندر سے نکالتی، لاتی ہیں اور پھر دُھینے کو بُلوا، اُس سے دُھنوا، نئے لحافوں

میں بھرتی، اُن پہ کالے سوت سے "نگندے" ڈالتیں، لمبی تان کے سو جاتی ہیں

سردیوں کے لئے تیار۔ اُن کے لئے چاہے کُہر پڑے

یا برف ـ مردوں کو ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ

ایک اذیت ہوتی ہے۔ اُن کے جسم ایک دم سیاہ اور سُرخ ہو اُٹھتے ہیں

اور مسام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر مقابل کے مساموں سے آن گنت بار جفت

ہونے کے لئے چل نکلتے ہیں ــــ مرد کا پورا جسم ایک پھنیئر سانپ کی طرح

پھنکارنے لگتا ہے۔

منگل گھر کی طرف قدم اُٹھانے ہی والا تھا کہ بائیں طرف

چھت پر سے آواز آئی: ——— "منگلا وے"

منگل نے اوپر دیکھا ——— یہ وہی جگہ تھی جہاں اشٹم کا چاند آکر رک گیا تھا، سلامتے کھڑی تھی اور اُس کے دھندلے سے نقش دکھائی دے رہے تھے۔ ایسے نقش، جو اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں کیونکہ وہ پورے نظر نہیں آتے۔

سلامتے نے کہا ——— "ٹھہر دے، مجھے تجھ سے کام ہے۔"

منگل جامد و ساکت کھڑا رہ گیا۔ اُس کے بدن میں اس وقت ایک ہی چیز حرکت کر رہی تھی ——— اُس کا دل، جس نے تمام تر سکوت کی کسر نکال دی ——— سلامتی اُدھر سے آ رہی تھی، جس طرف لکڑی کی سیڑھی جہلم کے گھر میں اُترنے کے بجائے، باہر اُترتی تھی، جس پر آزادانہ اُتر چڑھ کر عنایتی اور سلامتی اور جہلم لال مرچیں سوکھنے کیلئے ڈالا کرتیں، ——— جتنا آدمی پوری زندگی میں کرتا ہے، اُتنا منگل نے سلامتی کے کوٹھے پر سے اپنے آپ تک پہنچنے میں سوچ ڈالا۔

سلامتی، منگل سے کچھ دور کھڑی ہو گئی، چپ چاپ!

منگل نے پوچھا: ——— "کیا بات ہے، سلامتے؟"

"کچھ نہیں" ——— سلامتی بولی ——— اُس کی آواز میں

شکایتیں تھیں، حکایتیں تھیں اور آنسو تھے۔ گویا وہ کہہ رہی تھی۔ "تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی، لیکن دُکھ تجھے نہیں بتاؤں گی"

"بتانا" منگل نے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سلامتی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی، جیسے وہ ڈر گئی تھی۔

"پرے پرے" سلامتی بولی۔

ایک خوشبو اُڑ کر سلامتی کی طرف سے آئی ـــــ یہ خوشبو گاؤں کی خوشبوؤں میں سے نہ تھی، کیوں کہ اِن خوشبوؤں سے منگل کے مشام پوری طرح سے واقف تھے۔ یہ شہر کی خوشبوؤں میں سے تھی، جو محبت کو ایک قسم کی گوارا سی عفونت دے دیتی ہیں، بخلاف اس پسینے اور غلاظت کی بدبو کے جو تندرست بدنوں کی ناتمام محبت اور اُس کی تب و تاب میں صندل ہو جاتی ہے ـــــ منگل کے دل میں اواخر بھادوں کی ہواؤں سے جو شعلہ ایکا ایکی بھڑک اُٹھا تھا، اِس "پرے پرے" سے اور بھی لپک اُٹھا۔

سلامتی کے رکھ رکھاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بولا:

"تو مجھ سے ڈرتی ہے؟"

"ہاں ـــــ" سلامتی بولی ـــــ "یاد نہیں، اُس دن ...؟"

"ہاں، یاد ہے" ـــــ منگل بولا ـــــ "پر سب دن

ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں، سلامینے!" ـــــ اور وہ آگے بڑھ گیا۔
سلامتی پیچھے ہٹتی، "نہیں نہیں، نہیں نہیں" کہتی ہوئی دیوار سے جا لگی ـــــ اُس نے سوچ رکھا تھا۔ منگل کے ہاتھ پکڑتے ہی وہ شور مچا دیگی اور اُسے پکڑوا کر اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گی ـــــ ایک لمحے کے لئے اُسے خیال آیا، اگر یہ ریچھ کا بچہ، اِس ایک جست کے فاصلے کو جو اُس کے اور منگل کے بیچ رہ گیا تھا، پار کر کے اُسے پکڑ لے اور اُس کا مُنہ بند کر دے، یا مُنہ کو بالوں سے بھرپور چھاتی میں بھینچ لے تو وہ کیا کر لے گی؟ ـــــ اُس کی ساری منصوبہ بندی دھری رہ جائے گی......
اور وہ ریچھ آہستہ مگر یقیناً اُس کی طرف بڑھ رہا تھا ـــــ سلامتی کی آواز گلے میں اٹک گئی۔ وہ کانپ رہی تھی اور نہ جانتی تھی، منگل پر بھی کوئی لرزہ چھا رہا ہے ـــــ صرف ایک قدم، اور سلامتی کیلئے اب سب کچھ ناممکن العمل ہو گیا تھا۔ دونوں برابر آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں کو تلاش کر رہے تھے ـــــ ایسے میں صرف عورت کا دماغ کام کرتا ہے، مرد کا نہیں ـــــ جیسے پھر مرد کا کرتا ہے، عورت کا نہیں ـــــ اِس ایک قدم کے فاصلے کو منگل کی بجائے سلامتی نے پاٹ لیا اور اُچک کر منگل سے چمٹ گئی۔ اُس نے من جانے کے انداز سے منگل کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا جارحانہ عمل روک لیا ـــــ اور منگل ایک میٹھی سی آواز

میں بولا ـــــــ

"بول کیا کام تھا؟"

"کچھ نہیں ـــــ" سلامتی بولی ـــــ "سوچا تھا، ملے گا تو تجھ سے کہوں گی ـــــ "اڑیا! جتھے تیرے ہل وگدے، اوتھے نے چل جرکھا میرا ـــــ" اور پھر وہ ہنس دی ـــــ

منگل نے پھر ہاتھ بڑھائے۔ سلامتی بولی۔ "پاگل ہو گیا ہے؟ یہ بھی کوئی وقت ہے ـــــ جگہ ہے؟"

"نہیں نہیں"

"نہیں"

"تو پھر کب ـــــ؟ کہاں ـــــ؟"

سلامتی نے اکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"وہاں۔ جب اِدھر مندر میں گھنٹیاں بجیں، اور اُدھر مسجد میں مُلّا اذان دے..."

منگل نے پہلے اکھ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف، جہاں اُتر پچھم میں بھوئیں بھوئیں سے بادل جمع تھے۔ پھر سلامتی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا ـــــ "ہاں ٹھیک ہے، کل ہزاری نے وہاں سے شراب کا مٹکہ نکالا تھا" ـــــ اور اُس نے اکھ کی طرف اشارہ

کیا ــــــ "بس مٹکے دو مٹکے جتنی ہی جگہ ہے۔"

اور پھر اُس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مگر اُس کے پھڑکتے ہوئے ہاتھوں کو یقین نہ آ رہا تھا، اُن کے قابو میں کیا چیز آئی اور کیا نکل گئی؟ ــــــ اُس نے اپنے آپ میں ہمت کی بھی کمی پائی اور سوچا۔ آج دو گھونٹ شراب تیزاب کے اندر ہوتے تو مزہ آجاتا۔ اور پھر دن بھر اِسکے اور ڈھول کے بعد اُسے اپنا آپ کچھ گندہ بھی لگ رہا تھا۔ منہ سے ماں بہن کی گالیوں کی بُو آ رہی تھی ــــــ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا:

"اچھا سلامیتے! بھولنا نہیں"

"میں نہیں، تو ہی بھول جائے گا" سلامتی منگل کی نگاہوں کا شک دور کرتے ہوئے بولی

"نہیں" منگل نے کہا۔

ــــــ اور آدھے چاند کی رات میں منگل سلامتی کی نظروں کو دلتا ہوا چلا گیا ــــــ بدن میں ایکا ایکی تناؤ ساپیدا ہو جانے کی وجہ سے اُس کی چال ہی بدل گئی ــــــ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سانپ لہراتا ہوا بند ہو گیا تھا اور پیچھے سے دیکھنے پہ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں، کوئی لٹھ جا رہا ہے۔

سلامتی وہیں کھڑی اُسے جاتے دیکھتی رہی، اُسے بھی

بھادوں کے جھونکے لگے تھے اور اُس کا بدن ہوا میں پڑے سلگتے ہوئے کوئلہ کی طرح کبھی بھڑک اُٹھتا، کبھی بجھ جاتا ـــــ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے آدھی رات کے وقت جب منگل آئے گا تو سلامتی شور مچانے، اُسے پکڑوانے پٹوا دینے کے منصوبے کو عمل میں نہیں لائے گی ـــــ گھر کی طرف قدم اُٹھاتے ہوئے اُس نے اپنا تہہ بند کسا کہ سامنے سے عنایتی، سلامتے کی بڑی بہو آ گئی۔

"تو کہاں سے آیاں؟" سلامتی بولی۔

"سرمادائی کے ہاں سے جوشاندہ لے کر آئی ہوں"

"جوشاندہ؟ وہ کس لئے؟"

"مرنے کے لئے!" عنایتی نے بیزاری سے کہا۔

سلامتی کچھ نہ سمجھی۔ عنایتی نے کچھ شرماتے، کچھ مسکراتے ہوئے کہا ـــــ "عورت ہونا بھی ایک لعنت ہے"

"ہوہائے!" سلامتی نے کچھ تپاپاتے ہوئے کہا "روڈا پٹکی پڑا تو ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہوا؟"

"اِسی لئے تو یہ مر رہی ہوں" ـــــ عنایتی نے کاڑھے کی بڑی سی پڑیا کو ماتھے کے ساتھ مارتے ہوئے کہا۔

پھر دونوں مل کر گھر کی طرف چلدیں ـــــ سلامتی بولی:

"یہ سب کرنے سے پہلے تم نے مُراد سے پوچھ لیا ؟"

_____ مُراد عنایتی کے میلاں کا نام تھا۔

"آنہہ !" _____ عنایتی نے اپنی باہنہہ جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اُس نامُراد سے پوچھنے بیٹھتی تو ابھی گیارہ ہوتے _____ میرا پیٹ ہے کہ ملوک سنگھ کا آوا ؟"

سلامتی کو جھرجھری سی آئی _____ وہ الہڑ بہت کچھ نہ جانتی تھی لیکن کائنات میں مادہ تھی، جس کے رحم ہوتا ہے، وضع حمل اور تولید کے نام ہی سے جس کے اندر ایک نامحسوس سی کسمساہٹ دوڑ جاتی ہے۔ سلامتی نے کہیں دور کی بات سوچی۔ آخر یہ ہوتا ہے ؟ یہی ہوتا ہے تو پھر ؟ _____ تب تک عنایتی دروازے کے اندر پیر رکھنے جا رہی تھی۔ سامنے اُس نے مُراد، اپنے میاں کو اپنی سالی عائشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا اور اُلٹے پاؤں باہر آکر سلامتی سے بولی:

"اینٹے ! پھر ملا تجھے وہ بھاٹیہ لڑکا ؟"

"کون _____ ؟" سلامتی نے کہا۔ حالاں کہ جانتی تھی، عنایتی کہاں مار کر رہی ہے۔

"ارے وہی، اِستے والا منگلو !"

سلامتی نے جب تک سوچ لیا تھا۔ "نہیں" وہ بولی۔

اِس کے بعد اندر جا کر عنایتی، عائشہ، روڈے مُراد وغیرہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ جہلم پھر ترکاری کے بدلے صبح گوشت میں ڈالنے کے لئے چنے کی دال لینے گئی تھی۔

ابّے کا ہمیشہ کی طرح کچھ پتا نہ تھا ـــــ سلامتی ایک کھاٹ پر بیٹھ کر سوچنے لگی ـــــ اس دن کا دھاڑنے والا منظر اس کی آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور وہ شرم اور خجالت سے لال ہو اُٹھی ـــــ نہ جانے کیا ہو گیا مجھے! ایسے بھی کوئی مانتا چلا جاتا ہے کسی کی بات؟ وہ کہتا، اُتار دے اور بھی کچھ، تو میں وہ بھی اُتار دیتی ـــــ پاگل! کیسے پھر گلی میں آ کر کرتا پہنا اور اپنے یہ زخمی چھپائے ـــــ اللہ! کوئی دیکھ لیتا تو ـــــ؟

کچھ ہی دیر میں سلامتی اُبلنے، کھولنے لگی ـــــ بولا ـــــ "ہو گئی سیر، چلی جا اب" اور مجھے جانا پڑا ـــــ اتنی بے عزتی نہ ہوئی ہو گی، کسی ماں کی بیٹی کی ـــــ پر جس چیز کو آپاں بے عزتی کہتی ہے میں اسے بے عزتی نہیں کہتی ـــــ پھر وہ اُٹھی اور ہانڈی لے کر سب کو کھلانے پلانے کے بہانے عنایتی کے پاس چلی گئی اور جب سب جنے تھوڑے اِدھر اُدھر ہوئے تو اُس نے عنایتی کو منگل سے اپنی ملاقات کا واقعہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ملنے آئے گا ـــــ مدرسے کے باہر، ایکھ میں ـــــ

تھوڑی ہی دیر بعد مُراد گاؤں کے دو چار بدمعاشوں کو لے آیا ——— اپنی غریبی، اپنے افلاس کے باوجود وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ایک کافر کسی مسلمان لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے ——— سب نے مل کر جلدی جلدی لاٹھیاں، چھوریاں اور گنڈاسے جمع کر لئے اور پھر بیٹھ کر، برسوں پہلے کے، جاترن اور تلو کے کے قتل کی باتیں کرنے لگے

منگل نہادھو چکا تھا اور اب اپنی داڑھی کو کچی گھانی کا تیل لگا رہا تھا ـــــ صبح جب خیرے نے پڑے میں سرسوں ڈالی تو پہلی چند بوندیں بوتل میں منگل نے لے لی تھیں ـــــ نصیبوں والے اڈے سے لوٹ کر سلامتی سے ملنے کے بعد منگل چموں سے کھیلا' بڑی کی چوٹی بھی کھینچی اور ماں جنداں سے بڑی کے لئے "بابو" دیکھنے کی باتیں بھی کیں اور پورا گھر چہک اُٹھا۔

آج رانو اُسے اچھی لگ رہی تھی ـــــ ایسا معلوم ہوا جیسے اُس کی شادی کو دو چار سال ہی ہوئے ہیں۔ اور وہ بچے اُس کی بڑی سوت کے

ہیں، یا وہ بڑا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کے قتل ہو جانے پر اُس نے اُس کی بیوی پہ چادر ڈال لی ہے۔ نہیں نہیں، یہ تو نہیں ہوتا ـــــ چادر چھوٹا بھائی ہی ڈالتا ہے، بڑے بھائی کے لئے تو چھوٹے کی بیوی بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے۔

چونکہ منگل خود، معمول کے خلاف، آج شام کو نہا دھو کر صاف ستھرا ہوا تھا، اِس لئے رانو اُسے غلط سمجھ گئی تھی ـــــ وہ سمجھی، یہ سب میرے لئے ہے ـــــ رانو کو دیکھ کر منگل سمجھا، یہ اُس کی آنکھوں کا قصور ہے ـــــ لیکن نہیں، آج رانو اپنی ہی آنکھوں، اپنے ہی دل، اپنے ہی گالوں، ہونٹوں، کولھوں، رانوں کا قصور تھی ـــــ آج صبح جب وہ نہا کر جوہڑ میں سے نکلی تو سلفے کی لاٹ معلوم ہو رہی تھی"۔ پھر اُس نے گھر پہنچ کر دن میں کئی بار اُبٹنا مل کر جلد کو اتنی نرم اور چکنی بنا لیا تھا کہ اُس پر سے نگاہیں اور جذبے پھسل جاتے تھے اور پھر وہیں پڑے مچل جاتے اور اور اُس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک کوئی اُن کا ہاتھ پکڑ کر نہ اُٹھائے۔

پھر اُس نے بندی لگا رکھی تھی ـــــ کوئی غور سے دیکھتا تو پتہ چلتا آج وہ صرف بندی نہ تھی ـــــ وہ صبح کا سورج تھی، جو گہرا سُرخ ہوتا ہے اور تیز تیز اپنے محور کے گرد گھومتا جاتا ہے۔ پھر ایکا ایکی جیسے کرنوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر کسی نے چھپلا دیا۔ اخروٹ کی چھال کا رنگ ہونٹوں پر چھلا آیا اور

اب تک کے سوکھے ہوئے چھوہاروں کی بجائے وہ رس بھریوں کے ڈھیر معلوم ہونے لگے۔

منگل نے ایک بار پھر ذرا غور سے اُس کی طرف دیکھا اور پوچھا :

"تو آج باجار گئی تھی ؟"

رانو نے ایک اُچٹتی ہوئی نظر منگل پہ ڈالی اور پھر اُسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر نگاہیں چرالیں اور دُلہنوں کی سی دھیمی آواز میں بولی :

"ہاں"

اور پھر کام کاج کے بہانے اپنا آپ اِدھر اُدھر چھپانے ، وقت بتانے لگی۔

رانو کیا چھپا رہی تھی ؟ ——— یہ بات نہیں کہ وہ سگھڑ سیانیوں کی طرح اپنا سارا کچھ ایک ہی دم نہ دے دینا چاہتی تھی، بلکہ کوئی بات تھی جو اُبٹنے، بندی، اخروٹ کی چھال اور رس بھریوں سے اوپر ہوتی ہے جس کا تعلق عورت کی شکل وصورت سے نہیں ہوتا، نہ اُس کی نسائیت اور اُس کی انتہا سے، جسے وہ دھیرے دھیرے سامنے لاتی ہے اور جب لاتی ہے، تب پتا چلتا ہے، یہ بات تھی! جیسے اشٹم کا چاند اپنا آدھا چھپائے رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ، روز بروز، ایک ایک پردے ——— دوپٹے ، چولی، انگیا، سب کو الگ ڈالتا جاتا ہے اور آخر ایک

دن، ایک رات، پورنیما کے روپ میں آکر کیسی بے خودی و مجبوری، کیسی ناداری و لاچاری کے ساتھ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے ـــــ کیا علم النساء، علم النجوم سے دور کی بات ہے؟ کوئی بھی علم دوسرے علم سے فاصلہ رکھتا ہے؟ جن لوگوں نے برسوں اور عادتاً آسمانوں پہ جھانکا، ستاروں کو دیکھا ہو، اُن کی جھِل مِل کے ساتھ مرے، ہِل مِل کے ساتھ جیے ہوں، اماوس کے ساتھ مُرجھائے، پونم کے ساتھ کھِلے ہوں، وہی رجنی کی آنکھوں میں، پلکوں کے نیچے، زمینوں سے بڑی، آسمانوں سے بڑی، برق و مقناطیس کی وسعتوں میں، جو راس رچائی جاتی ہے، جو بھنگڑے اور جھمر اور لُڈی ناچے جاتے ہیں، اُن کے راز سمجھتے ہیں ـــــ وہی اشٹم کے چاند کا بھید بھی جانتے ہیں ـــــ!

منگل اِکے والا، پھر سلامت ہیں بے سلامت ہو کر اِس گھر کی اشٹم کا بھید کیسے سمجھتا؟ ـــــ اُس نے کبھی آسمانوں پہ جھانکا ہی نہ تھا۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا، وہ خود ایک ستارہ ہے ـــــ سورج جو کبھی کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا اُسکی طرف جو دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا ہے۔ اُس کے طلوع و غروب، اُس کے توازن و اعتدالِ شب و روز آپس میں سر ٹکراتے، مر جاتے، سلف کا حصّہ ہو جاتے ہیں، بنات النعش اُس کی طرف دیکھتی ہوئی معدوم، چاند بے نور، کاغذی ہو کر گھٹتا گھٹتا گھٹ جاتا ہے

اور آخر عدم کی پہنائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور وہ ــــــ سورج، بے خبر!

لیکن آج اس بے خبرے منگل کو، رانو کچھ خبریں دینا چاہتی تھی۔ وہ اُس گھونگھٹ کو اُٹھا دینا چاہتی تھی جو منگل اور اُس کے بیچ حائل ہو رہا تھا۔

گھنڈ، انھیاں کرے، سوجاکھیاں نوں
گھنڈ لاہ مُنہ اُتوں لاڑیے نی
وارث شاہ نہ دبیئے موتیاں نوں
پُھل اگّ دے وچ نہ ساڑیے نی

(گھونگھٹ دیکھنے والوں کو اندھا کر دیتا ہے۔ اے دُلہن! تو اُسے مکھڑے پر سے ہٹا دے۔ وارث شاہ! موتیوں کو دفنا کر نہیں رکھتے، نہ پھولوں کو آگ میں جلاتے ہیں)

اور آج رانو نے اُس پردے اور حجاب کو دور کر دینے کی ٹھان رکھی تھی، جسے ہٹائے بغیر خدا بھی نہیں ملتا۔

اِدھر منگل آج جیسے رانو کو رشوت دینا چاہتا تھا۔ اُس نے کُرتے کی جیب سے رانو کے لیے بالوں کی کچھ سوئیاں نکالیں، لوٹتے ہوئے جنہیں وہ قصبے سے لے آیا تھا ــــــ اُنہیں ہاتھ میں لیتے ہی رانی چونک اُٹھی۔ اُس کے مُنہ سے بے خودی کے عالم میں "ہا" نکلی۔

عورت میں لذت کی انتہا۔ لیکن منگل کہیں دور دیکھ رہا تھا ـــــ پھر لوٹ کر اُس نے پیسے نکالے اور رانو کے ہاتھ میں تھما دیئے ـــــ رانو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے، لیکن اُس نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا۔

"یہ آٹھ روپئے کہاں سے آ گئے؟"

"آج پسرور کی سواری لگی تھی"

"تو؟"

"تو کیا ـــــ؟ کھاؤ، خرچو!" ـــــ اور پھر پہلی بار، اپنی بیاہتا زندگی میں پہلی بار، اُس نے معنی خیز نگاہوں سے رانو کے سنگھار کی طرف دیکھا اور بولا ـــــ "خرچ بھی تو بڑھ گیا ہے"

اور رانو پہلی بار، اپنی نئی بیاہتا زندگی میں پہلی بار، ایک بیوی کی طرح شرمائی اور اُسے یوں محسوس ہوا، جیسے اُس کا اُبٹنا، اُس کی مہندی، اخروٹ کی چھال، اور رس بھریاں ننگی ہو گئیں۔ اُس نے سمٹنے کے پردے سے اپنا سب کچھ ایک بار ڈھک لیا ـــــ وہ منگل کے قریب ہونے میں کتنی دور اور دور ہونے میں کتنی قریب ہو ہو جاتی تھی ـــــ پھر اُس نے بھی سوچا، ابھی نہیں۔ ابھی تو مندر میں گھنٹیاں بھی نہیں بجیں۔ مسجد میں مُلّا نے اذان نہیں دی ـــــ

منگل نے کہا ـــــ "کھانا نکال دے جھٹ سے" ـــــ

"ابھی نہیں"

"کیوں؟ ــــ ابھی کیا ہے؟"

رانو کچھ گھبراسی گئی، وہ اِس سوال کا جواب نہ دے سکی۔

لیکن منگل نے خود ہی ایک انجانے پن میں اُسے اِس دُبدا سے نکال لیا۔

"کیا کوئی بہت ہی اچھی چیز پکی ہے؟"

"ہاں ــــ!" رانو نے کہا اور پھر کھٹّے سے اُس کے دو دپٹے میں کوئی توتا بولنے لگا ــــ "چنے کی دال پکائی ہے، ساتھ پودینے کی چٹنی کراری، مسالوں والی"

کتنی بھول ہوئی! ــــ منگل کو وہ سب یاد آگیا وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اُس کے نتھنے پھولنے لگے اور بال جیسے اپنے آپ پگڑی سے باہر آگئے ــــ اگر بالوں میں نہیں تو خیالوں میں ضرور اُس دن والی سن چھیٹیاں، آک کی بُڈھی مائیاں اڑی ہوئی تھیں ــــ وہ ایک دم خفا ہوکر بولا:

"دو، جو بھی پکا ہے۔ نہیں میں جاتا ہوں، ضروری کام ہے۔"

رانو سنبھلتے سنبھلتے پھر گر سی گئی ــــ اُس نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا ــــ اور ہی پکایا تھا ــــ شاید کوئی ایسی ویسی بات نہ بھی ہو۔ اچھا ہی ہے، جب لوٹے گا بچے سو چکے ہوں گے، سُسر کھوں کھوں

کھاتہ کھاتہ، ساس کے شروع رات کے خراٹے بند ہو چکے ہوں گے۔۔ ایسی خاموشی ہو گی کہ سانس بھی روکنے پڑیں گے ـــــــــ ایکاایکی منگل نے کہا:

"میری وہ کُرتی کہاں ہے؟"

رانو سمجھ گئی، سسنا گئی۔

"کہاں جارہا ہے ـــــــــ؟" اُس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا ـــــــ "دیکھتے نہیں، بادل گھرے ہیں؟"

"ہوں گے" ـــــــ منگل نے کہا ـــــــ "تو کون ہے روکنے والی؟"

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی، بولی:

"نہیں، میں تو کوئی نہیں ـــــــ ایسے ہی پوچھا تھا۔"

اگر رانی اڑ جاتی، جیسے تلوکے کے ساتھ اڑ جاتی تھی، اور کہتی "میں نہ روکوں گی تو اور کون روکے گا؟" تو منگل الف ہو جاتا ـــــــ لیکن وہ اپنی پھٹی ہوئی میلی بوسیدہ سی چادر کے رشتے سمجھتی تھی ـــــــ منگل رانو کے اس مریل سے جواب سے ڈھیلا ہو گیا اور بات کو ختم کرتے کے انداز میں بولا:

"جارہا ہوں رنڈی کے ہاں"

یہ فقرہ شوہر عموماً اُس وقت کہتے ہیں۔ جب وہ واقعی زندگی کے ہاں جا رہے ہوں اور بیویاں سمجھتی ہیں اُن کا میاں کسی غلط جگہ پہ نہیں جا رہا ورنہ نہ وہ ایسے کہتا؟ لیکن رانو کو حالات میں ہر لحظہ پیدا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دی تھی جو اُس کی دوسری بہنوں کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔۔۔ ایکا ایکی وہ دیوی سے ایک عام گوشت پوست کی عورت بن گئی۔۔۔ ایک دم چالاک اور عیار، حرافہ! کیا کرتی؟ وہ مجبور تھی اور بے بس۔۔۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے، اُن کے ساتھ بدلتا ہے، ورنہ پرماتما نے اُسے اتنا بڑا انسوں کا جال نہ دیا ہوتا۔

کرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا۔۔۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے بھی نتھنے پھولنے لگے جو منگل کو رانی کے ڈوپٹے میں دکھائی نہ دیئے۔۔۔ ایک بیوی مقابلے کیلئے، اپنے حقوق کی حفاظت کیلئے، ایک بیوا کی سطح پر اُتر آئی تھی۔۔۔ اپنی نگاہوں کے اُفق پہ اُسے سلامتی کا بدن لہراتا ہوا نظر آیا، جس کے بدن کے کسے کسائے، اور متناسب اعضا میں متقابل کیلئے قدرتی جگہیں بنی تھیں۔ جس کے جسم کی تازگی اور شادابی کو اُبٹنے اور سندی اور اخروٹ کی چھال کی ضرورت نہ تھی۔ جو سب چینزیں منگل سے استھول، بھر آدمی کیلئے بے کار تھیں، جو خود چٹان تھا، چٹانوں سے بھڑنا چاہتا تھا۔ خود لوہا تھا، لوہے سے ٹکرانا چاہتا

تھا، اور رانو جانتی تھی اور اُس کیلئے تیار تھی ـــــ اُس نے ایک آڑی نظر سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا اور بولی:

"وہاں پڑی ہے تیری کُرتی"

جب ہی باہر سے آواز آئی:

"رانو!"

رانو ایک دم باہر لپکی اور اُس سے پہلے کہ ودیا کچھ کہتی، رانو نے اُسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا:

"چلی جا، وِدّیا! اِس وقت چلی جا"

وِدّیا نے بے کار سی ضد کرتے ہوئے کہا:

"کیوں نی؟"

رانو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی:

"پرماتما کے لئے، بڑے بڑوں کیلئے"

اور وِدّیا حیرانی سے پیچھے دیکھتی ہوئی چلی گئی۔

رانو اندر آئی تو منگل ٹرنک کھول چکا تھا ـــــ اُس نے کچھ کپڑے اِدھر اُدھر بکھیر رکھے تھے۔ اُس کے ہاتھ میں مٹھے مالٹے کی بوتل تھی اور آنکھوں میں چمک ـــــ

"یہ کہاں سے آئی؟" اُس نے رانو سے پوچھا

"یہ کیا ہے؟"

"یہ ——— منگل نے بوتل کو ہوا میں اُٹھاتے ہوئے کہا ——— "مِٹھے مالٹے کی بوتل!"

رانو نے کچھ لرزتے، کچھ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"مجھے کیا معلوم؟"

اور اُسے بہت کچھ اپنا آپ چھپانے کی ضرورت بھی نہ پڑی ——— ڈبو رونے لگا تھا۔ رانو نے آدھی اندر، آدھی باہر جاکر بانہہ اُلارنی شروع کر دی تھی:

"ہات، ہات موئے! یہاں کیا دھرا ہے تیرے رونے کو؟ رو اُن کے ہاں جاکر، جن کے ہاں ترکاری ملتی ہے، گوس ملتا ہے۔"

اور پھر مُڑ کر بولی ——— تیرا بھائی پیا کرتا تھا نا"

"ہاں، مگر ———" منگل نے حیرانی سے کہا ———

"اِتنے برسوں سے؟"

"پڑی رہی ہوگی، ——— میں نے تو جب سے اِس ٹرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا"

منگل بوتل گھما گھما کر دیکھ رہا تھا، جیسے یقین نہ آرہا ہو۔

بالکل وہی شراب تیزاب جس کی اس شام اسے طلب تھی ـــــ جس سے اُس نے
چاہا تھا کہ اُس کی ہمت بڑھے، چیتے کی سی لپک آجائے ـــــ دس گھوڑوں
کی سی طاقت ـ اُسے بھی اپنے ذہنی افق پر ایک تر و تازہ، تندرست و
توانا لڑکی دکھائی دی ـ اُس نے تھوڑا اندر باہر ہو کر اوپر، آسمان کی طرف
دیکھا، جہاں اب بادل گھر آئے تھے اور چاند کو اپنے لحاف و توشک میں چھپا
لیا تھا۔

ضرور کہیں گرمی پڑی ہو گی، بخارات اُٹھے ہوں گے، جو
اِس مہینے بھادوں کے آخر میں کوٹلے کے اوپر چھا گئے ـ شاید کہیں رات اور
دن برابر ہونے والے تھے ـ بادلوں کے بیچ میں سے اپنا گریبان
پھاڑ کر دیکھتے ہوئے ستاروں سے اِس بات کی تسلّی کر کے کہ ابھی پہلا ہی
پہر شروع ہے، منگل لوٹ آیا۔ لیکن لوٹنے کے بعد وہ پہلا سا منگل نہ رہا تھا۔
ایک عجیب قسم کی کرختگی اُس کی نگاہوں میں چلی آئی تھی۔

”میں کبھی کبھی وہاں نصیبوں والے پر لگا لیتا ہوں ـــــ“ وہ
انگوٹھا اور مٹھی مُنہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

”میں جانتی ہوں ـــــ“ رانو نے کہا۔

منگل نے پروا نہ کی، نہ کسی استعجاب کا اظہار ہو۔ پھر اُس نے
بوتل کی طرف دیکھا اور حرص و آز نے بہت کچھ اُسے دیکھنے نہ دیا ـــــ

مثلاً رانو کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والا سیل، ـــــ ساتھ ہی اُس کا تیز ہوتا ہوا تنفس۔

"تیرے سامنے تو نہ پیوں گا۔" وہ اپنی ہی رٹ لگاتے ہوئے بولا۔

رانو چونکی ہوگی ـــــ "کیوں؟"

"تو بُرا مانتی ہے نا"

رانو کہنے جا رہی تھی ـــــ "نہیں، میں کیوں بُرا مانوں گی؟ میرا حق ہی کیا ہے؟" ـــ لیکن اندر سے کسی آواز نے اُسے روک دیا ـــ اُس کی نگاہیں پھر ایک حرافہ کی نگاہیں ہوگئیں اور وہ بولی:

"ہاں ـــــ تو جانتا ہی ہے، مجھے زہر لگتی ہے"

پھر جیسا کہ رانو کا اندازہ تھا، جیسا کہ وہ منگل کو جانتی تھی ـــ جیسا کہ وہ چاہتی تھی ـــــ منگل ایک دم بھنّا اُٹھا، ایک دم بوتل کے گلے میں مُٹھی گھماتے ہوئے اُس نے کاگ کو ڈھیلا کر دیا۔ پہلے چوروں اور پھر ڈاکوؤں کے انداز میں بولا:

"یہی ہے نا تم عورتوں کی بات ـــــ کھانے پینے سے بھی روکتی ہو اپنے مردوں کو" ـــــ اور وہ جھینپ گیا۔

رانو خوش ہوگئی ـــــ زبانی ہی سہی، مگر "عورت" اور "مرد"

کا رشتہ تو قائم ہوا ـــــ اوپر سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی:

"خبردار! میں نہ پینے دوں گی"

بالکل جیسا کہ رانو نے سوچا تھا، منگل نے کاگ نکال کر باہر پھینک دیا ـــــ بُو سی نکلی اور سارے کمرے میں پھیل گئی ـــــ رانو نے ایک ہاتھ سے ڈوپٹہ ناک کے سامنے کر لیا اور دوسرا ہاتھ منگل کے ہاتھ اور بوتل کے منہ پر رکھ دیا ـــــ منگل نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا:

"میں پیوں گا۔ ضرور پیوں گا"

"تو نے اپنے بھائی کو ہٹکایا تھا۔ بوتل توڑی تھی، مجھے چھڑایا تھا"

"وہ ـــــ؟ وہ تو تجھ پر ترس کھایا تھا"

پھر جیسا کہ رانو نے سوچا تھا، منگل نے اُس کے ہاتھ جھٹکنے شروع کر دیے ـــــ بیچ میں بڑی آگئی اور دونوں کو ایک دوسرے کے اتنا قریب پا کر ٹھٹک گئی ـــــ جب ہی باہر سے بادل کی گرج سُنائی دی۔

"جا تُو!" رانو اُسے دیکھ کر بولی ـــــ "کھانا کھلا دے، سُلا دے سب کو اندر، پانی پڑنے والا ہے"

بڑی نے باہر جاتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا ـــــ

آج وہ صبح ہی سے ماں کے تیور دیکھ رہی تھی، اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی۔

رانو پھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اُسے دھکیلنے لگا ــــ

اُس کے سخت اور کھُردرے ہاتھ، رانو کے بدن کے ہر حصّے کو لگ رہے تھے ــــ بیچ میں اُس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی، لیکن چادر کا بیع نامہ تھا، جو رانو کا بدن توڑ رہا تھا، مروڑ رہا تھا۔ وہ بار بار ایک دم بوتل منہ سے لگا کر پیتے، ہانپتے کانپتے ہوئے کہہ رہا تھا:

"میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں، جو ایک عورت کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا"

منگل نے اِس چھینا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی ــــ رانی کچھ اور لسلسی ــــ منگل نے اب کے اُسے نیچے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اُسے زدوکوب کرنے لگا، بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا۔ وہ اوپر اُٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور منگل اُسے دبانے کی... بیچ میں ایک ہاتھ سے بوتل اُٹھا کر وہ پھر پی گیا ــــ ہولے ہولے اُس کا چہرہ لال ہونے لگا ... خون کانوں اور سر کی طرف آنے لگا ــــ رانو کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ــــ اُس کے اعضا میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہو گئی، جسے زیر کرنا مشکل ہو گیا، ناممکن ــــ اب کے جو رانی اُٹھی تو منگل نے اُسے دیوار کے ساتھ دے مارا۔

خون کا ایک فوّارہ رانو کے سر سے چھوٹا اور اُس کی ٹانگیں اُسے سنبھالنے کے قابل نہ رہیں۔ وہ زمین پر پڑی تھی، آنکھیں بند اور منہ کھُلا ہوا۔

رانو کی خاموش بغاوت کے باوجود آواز اندر جنداں تک پہنچ گئی، اور وہ بولی:

"کیا ہے بہو؟"

ایک عجیب قسم کی لذّت سے بے ہوش ہوتے ہوئے رانو نے جواب دیا ——— "کچھ نہیں تائی! بلّی ہے" اور پھر اُس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی۔ بدن کے اعضاء ڈھیلے پڑ گئے۔ جہاں ہاتھ پڑا تھا، ہاتھ، ——— ٹانگ پڑی تھی، ٹانگ اور جہاں کپڑا پڑا تھا، کپڑا نیچے شراب گری تھی یا پانی ——— رانو کی شلوار تر بتر ہو رہی تھی۔

اب تک جو کچھ ہوا تھا، اُس سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا، دونوں میں سے کس نے پی ہے؟ نشہ کِسے آیا ہے؟ ——— کس کا اُترا ہے؟

منگل رانو کے پاس حیران کھڑا تھا ——— عجیب عورت ہے! اتنی مار پڑی اس پر بھی کہہ دیا ——— "بلّی ہے" ——— وہ شرمسار تھا اور شکر گذار بھی۔

پگڑی پھاڑ کر اُس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دئے۔

اور پھر کپڑے کو مٹھی میں رکھ کر اُس کی دھونکنی چلانے لگا۔ رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی، لگانے لگا۔ ویسے ہی جیسے اُس رات رانی نے کیا تھا۔ رانی کو آرام آرہا تھا، حظ آرہا تھا اور منگل کو رونا ـــــ اور اِس رونے میں کفارے کی تسکین۔ روتے روتے اُس نے رانی کے پاؤں پکڑ لئے۔ اب وہ اُسے اوپر کھینچ رہی تھی، اُس کا بدن سہلا رہی تھی، جیسے مار اُسے نہیں، منگل کو پڑی ہے۔

"معاف کردے، مجھے معاف کردے ـــــ" منگل رٹ لگائے جا رہا تھا۔

"وعدہ کر، پھر نہ پیئے گا" ـــــ رانو نے اُس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا، اور پھر ایک دم کسی خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کیلئے پیش قدمی کرتے ہوئے بولی ـــــ "وعدہ کرے گا تو میں آج تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں" ـــــ منگل نے کہا اور پھر سوچنے لگا ـــــ اُس نے کس بات کا وعدہ کیا ہے؟ رانو آہستہ سے اُٹھی اور باہر چلی گئی۔ منگل بیٹھا برتنوں پر بارش کی جلترنگ سن رہا تھا۔ بڑی نے سب کو کھلا پلا دیا تھا اور کہیں دور، اندر سُلا دیا تھا، جیسے ہمیشہ کیلئے جیسے انسان اور قدرت کے درمیان اِس عظیم سازش میں وہ بھی شریک ہو گئی

تھی۔ رانو نے تنور کو برسات سے بچانے کیلئے اس پر ایک بڑا سا دابڑا رکھ دیا اور پھر کھانا لے کر اندر چل دی۔

رانو لوٹی ___ تھالی میں ایک طرف روٹی پڑی تھی، اور دوسری طرف کچھ پیاز اور چانپیں! ___ منگل نے حیران ہو کر چانپوں کی طرف دیکھا اور پھر رانی کی طرف اور اُس کے منہ میں پانی آنے لگا ___ رانو نے گلاس میں ایک دم بہت سی شراب انڈیل دی اور منگل کے ہاتھوں میں تھما دی۔ منگل کو جیسے یقین نہ آ رہا تھا ___ کھانے سے نظریں ہٹا کر اُس نے رانی کی طرف دیکھا، جس کی نگاہیں پیار سے بنی ہوئی تھیں ___ پھر وہ انکار نہ کر سکا ___ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا:

"آج کے بعد پیوں، تو سمجھو۔ گائے کھاؤں۔"

اُس نے گلاس منہ کی طرف اُٹھایا تو رانو نے روک دیا:

"ٹھہرو" ___ جیسے اُسے کوئی بات یاد آ گئی ___ وہ باہر آ گئی، اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چینی کی رکابی تھی، اور اُس میں دل کی شکل کا ایک ٹماٹر، جو آٹھ حصوں میں کٹا پڑا تھا!

منگل پینے اور کھانے لگا۔ رانو رو رہی تھی ___ ایسا مزہ منگل کو نصیبوں والے اڈے پہ کہاں آیا تھا؛ ___ روتے کانپتے ہوئے رانو نے اور اُنڈیلی، اور، اور ...... اور شراب رانی کو چڑھ گئی، رانی کو۔

چھپنے کے لئے وہ کھلنے لگی ـــــ پہلے جالی کا دوپٹہ جیسے اتفاق سے گر گیا ـــــ پھر کُرتے کے تکمے کھُل گئے۔ جب ہی مندر کے گھنٹے سُنائی دیے۔ پھر مسجد سے اذان۔

"ہات" منگل نے گھنٹے اور اذان سُنتے ہوئے کہا۔

"ہات کیا؟" ـــــ رانو پوچھنے لگی۔

"یہ" ـــــ منگل نے اپنا غیر یقینی ہاتھ جہلم ارا عین کے گھر کی اُٹھاتے ہوئے کہا ـــــ "یہ مُلّا اور پنڈت"

اور اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی ـــــ دروازے تک گیا بھی لیکن گھُپ اندھیرا دیکھ کر، لڑکھڑاتا ہوا، اپنی جگہ پہ آ رہا۔ پھر ایکا ایکی اپنی آنکھوں پر پورا زور ڈالتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا۔

رانی کھڑی تھی ـــــ پونم کا چاند! ـــــ جو بے صبر ہو کر آدھے سے پورا ہو گیا تھا ـــــ اور بادلوں کے لحاف و توشک کو چیرتے، پھاڑتے ہوئے، نیچے زمین پر اُتر آیا تھا۔

منگل اُٹھ کھڑا ہوا اور سانس روک کر دیکھنے لگا ـــــ

بمشکل تمام وہ بولا:

"تم... تم نے کپڑے کیوں پہنے ہیں؟"

رانی نے اپنا پھٹا پُرانا جالی کا دوپٹہ اُٹھایا اور اُسے اپنے

اور منگل کے بیچ تانتے ہوئے بولی:

"لو اُتار دیئے۔"

اور دوپٹے کو دو اُٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھامے، رانو پہلو کی طرف مڑی ——— عورت کا حُسن تلاتم منگل کے سامنے تھا، جس سے گیہوں کی روٹی کھانیوالا کوئی بھی مرد انکار نہیں کر سکا۔ اور بیچ میں لطیف سا پردہ ——— پھر، اس حسن پر ایک انگڑائی ٹوٹی ——— سال کے باون ہفتے، ہفتے کے سات دن، دن کے آٹھ پہروں، گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے، جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پاؤں تک گہنا دیتا ہے۔

منگل کے چہرے پر سرخیاں اور سیاہیاں دوڑ گئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کے مسام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں چل دیے۔ کبھی بارش کے ڈر سے چھپتے، کبھی اُس کیلئے باہر آتے ——— ساون اور بھادوں میں تو بارش ہمیشہ ہوتی ہے جہاں تہاں کبھی ہوتی ہے لیکن بڑوں کا کہنا ہے کہ جب بھادوں اور اسوج کے بیچ دن اور رات ملتے ہیں، برابر ہوتے ہیں، تو دیوی کے کوٹلے پر ضرور چھینٹے پڑتے ہیں۔ بے شمار پڑتے ہیں۔

منگل نے ایک اندھے کی طرح لپک کر، ——— اندازے ہی سے رانو کو کلاوے میں لے لیا۔ پھر ایک ہی لمحے میں وہ جسم کے تپتے

ہوئے زعفران زاروں پہ تھے۔

اِس سے پہلے کہ اُن کے سانس تیز ہوتے وہاں پہنچ جاتے، جہاں سے وہ پھر لوٹ کر نہیں آتے ـــــ منگل رانو سے کہہ رہا تھا:

"آج تم ..... کتنی کھوب شورت لگ رہی ہو ..... بھابھی!"

(۹)

گھر کے دروازے میں کھڑی، آسمان سے مسلسل بارش پڑتے
دیکھ کر سلامتی جھلّا رہی تھی، اپنے تاکوں پہ ہلکے ہلکے تھپیڑے لگا رہی تھی ___
پھر وہی ہاتھ اُس نے کولھوں سے نیچے تھپکنے شروع کر دئے اور سی سی کرنے
لگی، جیسے غلطی سے اُس نے ایک ساتھ بہت سی مرچیں کھا لی ہوں ___
گھنٹے اور اذان کی آخری گونج اُس کے کانوں سے معدوم ہو رہی تھی، اور
وہ مُلّاؤں اور پنڈتوں کو کوسنے دے رہی تھی، جنہوں نے انسانی جسم بنایا
تو نہ تھا، البتہ اُس سے انکار، اُسے گالی دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے۔
رات کے دوسرے پہر کا آخر تھا اور بارش تھی کہ ہٹ ہٹ کے

پڑی رہی تھی پدر سے کے برآمدے میں، ایکھ کے برابر کھڑے مراد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

"بکواس ہے یار، یہ عورت بھی"

خلیفے نے اتفاق کیا اور اللہ داد اور حکومت نے بھی...

اور پھر سب اپنے اپنے لٹھ، اور ٹوکے اور چھویاں اور گنڈاسے لے کر بارش میں بدن کی چربی تک بھیگتے ہوئے اپنے اپنے گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے چلد یے:

"بچ گیا، بکھڑا۔"

مراد کو نامراد لوٹتے دیکھ کر دور، اندر، چارپائی پہ پڑی ہوئی سلامتی نے ہاتھ مار کر دیے کو بجھا دیا۔ پھر اپنے بدن پہ اُس دن کی آخری انگڑائی توڑی اور بولی:

"شکر ہے اللہ!"

(۱۰)

آج سورج نے چھدرے چھدرے بادلوں کے پیچھے اپنا منہ چھپا رکھا تھا۔ آج آسمان کے کوٹلے پر کوئی نادار، اپنی محنت سے شرمسار، روتا، کڑھتا ہوا اپنی پھٹی پرانی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا۔

ہوائیں چلنے لگی تھیں، جن کے دوش پہ لہراتے ہوئے کہیں دب نار، کوک نار، اور پامیر اور سلیمان کی طرف سے چھوٹے چھوٹے سفید پرندے آنے شروع ہوئے۔ معلوم ہوتا تھا دور، ہزاروں فرسنگ دور کہیں کھیلنے والے بچوں نے کاغذ کی کشتیاں

وقت کے دھارے پہ چھوڑ دی ہیں۔ یا دلشنو دیوی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں وہ سب نذرانے لوٹا رہی ہے، جو صدیوں میں جاتریوں نے ڈھولکیاں اور چھینے بجا بجا کر، امبا دیوی کی استتی گا گا کر، اُس کی خدمت میں پیش کیے تھے۔

شب و روز بے اعتدال ہو رہے تھے ـــــ راتیں، دن پہ بھاری ہونے لگیں ـــــ شکست خوردہ سورج شب کے سامنے شرمایا اور بادل کے پردے سے منہ نکال کر اپنی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔ بس اُس کے مسکرانے کی دیر تھی کہ تیتر کے پروں پہ رنگ بکھر گیا ـــــ دُرّاج و سارس کی چال میں نئے انداز چلے آئے اور نیم کی نازک سی ڈالی پہ جھولتی، وزن درست کرتی ہوئی جھانپں کے گلے میں سے ایک مترنم اور مطیب بے اختیاری پھوٹ نکلی ـــــ سورج نے نہ صرف جامن اور بکائن اور ٹنڈے پیپل کے پتوں سے صلح کی، بلکہ ببول اور کنوار گندل کے بدن پہ اُگے ہوئے کانٹوں کو بھی اپنا کہا اور زمین کے آنسو چوم چوم لیے۔

کسانوں نے کہیں آنسوؤں کے بیچ زمین کو زیر لب، دبی دبی ہنسی ہنستے دیکھ لیا اور وارفتہ ہو کر اپنے اپنے ہل نکال لیے اور اس مست الست کاشت کو خریف کا نام دیا ـــــ چھوٹے چھوٹے بچے تک

شہتوت کی کچی کنواری ڈالیاں توڑ لائے اور اُن کی کمانیں بنا، اُن پہ چلے چڑھا، اِدھر اُدھر بے ربط سے تیر پھینکنے لگے ـــــ مسجد میں مُلّاؤں نے اور مندر میں پنڈتوں نے تمناؤں کی اشومیدھ کے گھوڑے چھوڑ دئے اور پوری کائنات ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی جنددہ بازی میں لگ گئی ـــــ

منگل نے اپنا ساز نکالا اور اس پر کلغی سجائی ـــــ رانی نے تنور پر سے دائرہ اُٹھایا اور اُس کے کچھ گیلے ہونے کی وجہ سے اس میں ڈھیر سی چیلیاں اور من چھٹیاں ڈال دیں۔ رات کی آمدنی سے ایک روپیہ نکال کر تڑی کو دیا تاکہ جاتوں کے ہاں جا کر خالص گھی "تُلوا کر لیتی آئے ـــــ

مدرسے میں بڑے بچّوں کے ششماہی امتحان ہو رہے تھے، اِس لئے چھوٹا چموں جہلم اراعیں کے ہاں مولیاں اور آلو لینے کے لئے پہنچا تو سلامتی سر کے گرد جالی کا دوپٹہ باندھے بیٹھی تھی اور کنپٹیوں پہ آٹے کی چڑیاں لگائے۔

چموں کو مولیاں اور آلو خریدتے دیکھ کر سلامتی بول اُٹھی:

"کیا بات ہے چمیا! آج تمہارے آلو اور مولی کی روٹیاں پک رہی ہیں؟"

"روٹیاں نہیں، پراٹھے ـــــ" چموں نے اِتراتے ہوئے کہا۔ ماں نے تنور تپایا ہے نا۔"

"ہائے ہائے وے"۔ جہلم کہنے لگی۔ "تیری ماں نے تنور تپایا ہے؟"

"ہاں" ـــــ چمّوں نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا:
"تمہیں پراٹھے لگوانے ہوں تو آجاؤ، یا سلامتی کو بھیج دو"

پھر وہ سبزی لے کر چلا گیا اور پیچھے جہلم، عنایتی اور عائشہ ہنستی رہیں، ـــــ سلامتی طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ سے جلی بھنی سنتی رہی۔

پکتے ہوئے پراٹھوں میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے حضور سنگھ اور جنداں کو للچا رہی تھی۔ حضور سنگھ سے نہ رہا گیا ـــــ "ذرا نرم لگانا بیٹی!" اس نے کہا ـــــ "میرے دانت کام نہیں کرتے"

اور جنداں بھی نہ رہ سکی۔ بولی۔ دیکھ تو، ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے۔"

رانی نے گھی میں بسے پراٹھے، نئے، صاف ستھرے جھاڑن میں باندھ کر منگل کی طرف بڑھا دیے ـــــ منگل نے مخمور سی نگاہوں کے ساتھ رانو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کیچڑ سے پٹے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

"بہت محنت کرنی پڑے گی؟"

رانو نے دیکھتے ہوئے کہا: "ہاں" ـــــ اور پھر ایک ایک محجوب سی نگاہ منگل پر ڈالتے ہوئے بولی ـــــ ہم عورتیں اور بنی کس لئے ہیں؟"

منگل نصیبوں والے اڈے کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ رانو کو کوئی بات یاد آگئی اور وہ فوراً بول اُٹھی: "ٹھہرو"

منگل وہیں رُک گیا۔ کچھ دیر میں رانی دوڑی ہوئی آئی اُس کے پاس آئی اور بولی:

"مجھے دو شلواروں کا کپڑا لادو۔ تیوہار آرہے ہیں"

منگل نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو اپنے بدن پہ سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہنے لگی: ـــــ "سب کے پاس یہ ہے، میرے پاس ہی نہیں ـــــ" اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرائی نہیں، کھل کھل کر کے ہنس اُٹھی۔

منگل نے تھوڑا سر ہلاتے ہوئے کہا:

"اچھا، دیکھو"

"دیکھو دیکھو کچھ نہیں ـــــ" رانو نے بے جھجک کہہ دیا "میں کیا سب کے سامنے بنا شلوار کے پھروں گی؟" ـــــ اور پھر بولی:

"میرا تو کچھ نہیں جاتا...

منگل نے ایک دم اپنا سر ہلایا جیسے اپنے حق کو کسی دوسرے سے خلط نہ کرنا چاہتا ہو ـــــ رانو پھر کہنے لگی:

"چنّوں کو اس کے گھر والے نے صوف کا سوٹ سلوا دیا ہے ـــــ کیسا اچھا لگتا ہے، اُس کے گورے گورے پنڈے پر کالا کالا، نرم نرم صوف۔"

منگل سوچنے لگا۔

رانو نے اور آگے ہو کر منگل کے اریب کرتے کا دامن تھام لیا اور بولی:

"تم آج پھر لیپرور نہیں تو گوجرانوالے، نہیں سیالکوٹ، سمبڑیال کی سواریاں ڈھونڈھ لینا ـــ بچے بھی قمیصیں مانگتے ہیں"

منگل جیسے ایک دم فرمائشوں کے شیریں و تُرش انبار کے نیچے دب گیا ـــــ ساز میں سے کلغی نیچے گر گئی، جسے اُٹھاتے پھر سے ساز میں ٹکاتے ہوئے اُس نے رانی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اُسکا کرتا تھامے ہوئے تھی، جیسے منگل اُس کا چور تھا ـــــ جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا۔

"اچھا بابا، اچھا" منگل نے اپنا کرتہ چھڑا لیا اور چلدیا

رانی السائی سی کھڑی، چوکھٹ میں جڑی، ہمیشہ کی طرح اُسے جاتے دیکھتی رہی ـــــ اُس کا مرد، تعمیل اور تکمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کر دیا تھا۔ پھر رانی اُسے دیکھ کر ٹھٹک گئی ـــــ تلوکا! ـــ نہیں، منگل ـــــ منگل! لیکن یہ وہ منگل تو نہ تھا، جسے ایک دن رانو نے دیکھا تھا، جس دن چنوں نے اُس پہ چادر ڈالنے کی بات کی تھی اور ایک البیلے پن میں وارث گاتے ہوئے جسے گلی کے نکڑ نے لپک لیا تھا ـــــ آج وہ چُپ تھا اور اُس کے چوڑے چکلے کاندھے محبت کے بوجھ سے دب گئے تھے۔ جس کے کارن وہ آپ ہی اپنا بڑا بھائی معلوم ہو رہا تھا۔

وہ جا رہا تھا، اور گلی کے نکڑ جیسے پرے ہو گئے تھے۔

گاؤں کے باہر کے کالے کوس ایک دوسرے میں اُلجھ گئے تھے ـــ اُلجھتے سلجھتے راستے کہیں بھی جاتے تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ اُن پہ اُڑتی ہوئی دھول اور گرد، کیچڑ اور غلاظت میں ہر منگل کا خون اور پسینہ رچا ہوا تھا ـــــ پھر راستوں کے اِس گورکھ دھندے میں ایک راستہ ضرور ایسا تھا، جو ہر جانور، ہر انسان کو سرِ شام "گھر" لے آتا تھا۔

اپنی نگاہوں کے دھندلکے میں منگل کے حل ہوتے ہی رانی اندر لوٹ گئی۔ آج اُس کے پاؤں یقین سے زمین پہ پڑ رہے تھے آج ہر چیز کتنی

آسان، کتنی سبک ہوگئی تھی ـــــ جس کے مقابلہ پہ اپنے کیچڑ سے پٹے آنگن کو صاف اور ستھرا اور پھر سے مہمان نواز بنانا کوئی محنت کی بات ہی نہ تھی۔

کسی کو اندازہ نہ تھا، اب کے کوٹلے پہ اتنا جاتری پڑے گا۔
کسی کو گمان بھی نہ تھا، اب کے سامنے پہاڑوں پہ وقت سے پہلے برف
پڑ جائیگی اور امبا دیوی سب بھگتوں کو کوٹلے کی طرف بھیجدے گی اور
پسرور، گوجرانوالہ، سمبڑیال، سیالکوٹ، ستراہ، ستوکی سے سواریاں آئینگی
لاریوں اور بسوں پر، تانگوں اور اِکّوں پر، بیل گاڑیوں اور چھپتاریوں پر!
کسی کو معلوم نہ تھا، کوٹلہ کے گاؤں کے لوگوں کے گھر دولت
سے بھر جائیں گے اور اُن پر دھن برسنے لگے گا ـــــ دیوانے شاہ کا سودا بک
جائے گا اور جاٹ کا گھی، خیرے کا تیل اور جہلم کی سبزی ـــــ کبوتر مندر کے

کلس سے گاؤں کی گلیوں میں اُتر آئیں گے اور دانہ کھائیں گے اور اُن کے پیار کی "گھوں گھوں" چوبیس گھنٹے چلنے والی آٹے کی مشین کی "کو، کو" میں گُم ہو جائے گی، اور برات گھر، دھرم شالہ اور ذیلداروں کی حویلی میں تِل رکھنے کی جگہ نہ ہو گی اور لوگ دس دس، بیس بیس روپے ایک ایک کوٹھڑی کے دیں گے۔ سُنار کی بالیاں، ٹھٹھیار کی تھالیاں، چراغ کے جوڑے، کمہار کے کوزے، سب بِک جائیں گے اور بڑ پہ پتّہ رہے گا نہ محراب پر شہد کا چھتہ ـــــ اور ابھی لوگ آ رہے تھے، ناچتے اور گاتے، دف کوٹتے، نفیری بجاتے: "بچانا ہے تو بچا لو، امبا جی! پاپیوں کے بچانے کی یہی بیلا ہے۔"

کوئی نہ جانتا تھا، سال کے اِس حصّے میں کوٹلے کی عورتیں کیوں اوپر سے سوکھشم اور نیچے سے استھول ہو جاتی ہیں؟ کوئی کہتا، اس کی وجہ پچھلی گرمی ہے، کوئی آنے والی سردی، اور پھر وہ ہنسنے لگتے ـــــ گاؤں کی گج گامنیاں ہاتھوں میں تھالی، تھالی میں صد برگ، صد برگ میں سیندور لیے مندر کی طرف چل نکلتیں اور اپنی ہی چال میں مست کہیں ایک کوٹھے پر تھم جاتیں تو گیان چند اور کیسر سنگھ، رلدا اور دیوانے کی نبضیں چھوٹ جاتیں۔ اُن کے جاتے ہی وہ ہوش میں آجاتے، اور یک زبان ہو کر چلّا اُٹھتے:

"ہوئے ہوئے!"

آج ہی بڑی پر کرما کا دن تھا۔ حضور سنگھ اور حنیداں تک باہر گئے تھے، لیکن رانو گھر ہی میں بیٹھی تھی۔ اُس کے کارن بڑی بھی نہ گئی تھی۔

جوان جہان لڑکی اور اس پہ پر کرما کے لئے آئے ہوئے ہزاروں البیلے، اس کی ایک اُنگلی بھی کسی کے حصہ میں نہ آتی۔ شلاپہ کوئی لال لال چیز پیس کر رانو اُسے انگلی سے سمیٹتی ہوئی ایک کٹوری میں رکھ رہی تھی۔ کھُلے ہوئے بیسن میں ہری مرچ کی دُم نظر آتی تھی اور آلو کے قتلے اور چوٹھے پہ کڑاہی چڑھی تھی، جس میں سرسوں کا تیل اُبل رہا تھا۔

جب ہی جینوں کالے صوف کا سوٹ پہنے، گلے میں گلابی دوپٹہ اُڑاتی ہوئی اندر آئی۔ کالی قمیص میں سے اُس کا گورا گورا سینہ، محبت اور کینہ لیے زندگی کا سیاہ وسفید سمجھا رہا تھا۔ رانو کو چپ کے اور صحن میں یوں کھم گرٹی دیکھ کر جینوں بولی:

"ہائے ہائے نی خصم کھانیے! آج کے دن تو گھر مری ہے؟"

رانی نے یونہی سا سر ہلا دیا۔

جینوں اور پاس آتے ہوئے بولی ___ "باہر سب چھٹڑیاں[1] کھڑی تیری جان کو رہی ہیں اور تو یہاں کیا کر رہی ہے؟"

اور جینوں کی نظر رانو کی گلبرے کی شلوار پر جا پڑی ___

"یہ بات؟" جینوں نے اُسے چھوتے، سر ہلاتے ہوئے کہا۔

---

[1] طلاق شدہ عورتیں۔

رانو نے چنوں سے جان چھڑانے کے لئے کڑاہی میں پونی ڈال دی ـــ ہاتھ اوپر اُٹھے تو چنوں کو رانو کے کرتے کے اندر کچھ اور ہی گول سڈول، کچھ مخروطی سا نظر آیا۔ اُس نے بڑھ کر اوپر ہی سے کرتے میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر فوراً ہی باہر نکال کر جھٹکنے لگی ـــ "ہائے ہائے میں مرگئی!" ـــ وہ بولی جیسے جلتے ہوئے کوئلے چھو لئے ہوں ـــ "ظالم ہوتا ہے منگل تیرے ساتھ سیدھا ہو گیا؟"

رانو کچھ نہ بولی ـــ دوسرے ہاتھ سے شلاپہ پسی ہوئی لال ہری چیز کے چٹخارے لینے لگی۔

"یہ کیا؟" ـــ چنوں نے پوچھا۔

اور پھر اُس نے غور سے دیکھا، کھٹ مٹھی چٹنی تھی۔ چنوں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں۔ ایک اُنگلی سے اُس نے بھی چٹنی کو منہ میں ڈال لیا اور سی سی کرتی آگے بڑھتی رانو کو شانوں سے جھنجھوڑتی ہوئی بولی۔

"ہائے ہائے نی رنڈیے... ؟...!"

رانو اوہنوں آہناں کرتی ہوئی پیچھا چھڑانے لگی۔

"سچ بتا" ـــ چنوں بولی ـــ "نہیں تو میرا مرا منہ دیکھے ـــ بتا، تجھے میری سوگند"

رانو نے کچھ گھور گھار کے بڑی کی طرف اشارہ کیا، جو کی نشانی

تھی۔ پھر چنّوں کے کان کے پاس مُنہ کرتے ہوئے بولی:

"ہا ہو!"

چنوں ایک دم تھرک اُٹھی ـــــ ایک ہاتھ کولھے پر، دوسرا سر پر رکھے وہ اپنے محور کے گرد گھوم گئی اور پھر ایکا ایکی باہر کی طرف لپکی ـــــ چلاتی، پکارتی ہوئی: "نی سروپو! ـــــ نی چاچی پورو! ـــــ وِدّونی! ـــــ اڑیے کہاں مر گئیں ساری کی ساری؟"

جتنی تیزی سے چنوں باہر نکلی اُتنی ہی تیزی سے منگل اندر آیا ـــــ دروازے میں دونوں کی ٹکر ہوگئی۔ چنوں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی ـــــ منگل کی پگڑی پرے جا گری اور جوڑا کھُل گیا۔ اُسے یوں دیکھ کر چنوں کچھ ہنستے، کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی:

"اندھا! دکھائی نہیں دیتا۔ پورا کوڑما[1] ہی دھرت راشٹروں[2] کا ہے۔"

"پر، چنوں" ـــــ منگل نے پگڑی اُٹھا کر بات شروع ہی کی تھی کہ چنوں بھاگ گئی ـــــ منگل نے جوڑا لپیٹتے، پگڑی پر سے گرد جھاڑتے ہوئے آواز دی: ـــــ "رانو"

رانو، سامنے ہی بیٹھی تھی لیکن چونک پڑی۔ آج منگل نے

---

[1] خاندان [2] دھرت راشٹر کوروؤں اور پانڈوؤں کا جدِ امجد جو اندھا تھا۔

پہلی بار اُسے اُس کے نام سے پُکارا تھا ـــــ وہ "رانی" بھی کہہ سکتا تھا۔ لیکن "رانو!"... ضرور کوئی بات تھی ـــــ رانو نے منگل کی طرف دیکھا جو اُس کے پاس آکر اُکڑوں بیٹھ گیا تھا، جیسے کوئی راز کی بات کہنا چاہتا ہو۔

"سُن رانو ـــ کمال ہوگیا ـــ حد ہوگئی"

رانی اندر ہی اندر مسکرا رہی تھی، بولی:

"پہلے تم کہہ لو، پھر مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ہے"

"کیا کہنا ہے؟"

"پہلے تم کہہ لو"

منگل کہنے ہی والا تھا کہ اُس کی نگاہ بڑی پر جا پڑی جو دیوار کے پاس کھڑی تھی اور جس کی نگاہ باہر کی طرف تھی اور کان ماں باپ کی طرف۔ اُس کی طرف دیکھتے ہوئے منگل بڑے پیار سے بولا۔

۱۳۰۹ / ۱۱۲

"بیٹیا! تو اندر جا"

بڑی، چھوٹی سی ہو کر اندر چلی گئی۔ منگل بولا:

"جاتریوں میں ایک لڑکا آیا ہے۔ پچیس چھبیس برس کا گبھرو جوان، ڈسکے کے متصدی کا بیٹا ـــ زمینیں، مکان، دوکانیں ـــ جائیداد....!"

رانو کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ کہہ اُٹھی:

"تب تو وہ ..."

"ارے تو سُن تو!" ـــــ منگل بولا ـــــ "وہ کہتا ہے میں شادی کروں گا تو بڑی سے، دُنیا کی کسی اور لڑکی سے نہیں!"

"نہیں!" ـــــ رانو نے ایک دم سب کام چھوڑ دیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"تیری قسم" منگل نے کہا، اور اُس نے آج پہلی بار رانو کی قسم کھائی تھی ـــــ رانی کی سانس تیز ہونے لگی۔ گلبرے میں اُس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی:

"اُس نے بڑی کو دیکھا ہے؟"

"ضرور دیکھا ہوگا۔ شاید نہ بھی دیکھا ہو"

"نہ دیکھا، نہ ملا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیا معلوم؟" ـــــ منگل بولا ـــــ "گاؤں کے پنچ بھی یہی چاہتے ہیں۔ اور تو، تو جانتی ہے، پنچوں میں پرمیشر ہوتا ہے!"

"ہاں ـــــ" رانی مان گئی ـــــ "پنچوں میں پرمیشر نہ ہوتا تو آج میں کہاں ہوتی؟"

کچھ شہ پاتے ہوئے منگل جاری ہوا ـــــ "وہ سب کہتے ہیں، تیری بیٹی راج کرے گی، رانی بنے گی۔ مطلب، تم ایسی رانی نہیں۔

وہ ... وہ جو اصلی ہوتی ہے۔"

یہ سب کچھ رانی کیلئے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ لیکن منگل کہے جا رہا تھا۔ "وہ کچھ لینے دینے میں بھی نہیں، اُلٹا سختی سے انکار کرتا ہے۔" اور پھر ایکا ایکی کسی خیال کے آنے سے وہ کہہ اُٹھا ــــ "اِس کا یہ مطلب نہیں، میں کچھ دوں گا نہیں۔ مجھ سے جو کچھ ہو گا، دوں گا اپنی بیٹی کو، ــــ پیچھے تھوڑی رکھ لوں گا؟"

"اپنی بیٹی!" ــــ رانو کے کانوں کو یقین نہ آ رہا تھا۔

"میں تو اِس کیلئے بِک جاؤں گا، رانو!" ــــ منگل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ــــ "چاہے اس کے لئے مجھے اِکّا اور بکّی کیوں نہ بیچنے پڑیں۔"

جب ہی منگل کو کچھ یاد آیا ــــ "تم بھی کچھ کہہ رہی تھیں؟"

"کچھ نہیں" ــــ رانو بولی ــــ "سرمادائی کو بُلوا دو ــــ مجھے ابھی سے اُس کے ساتھ بات پکّی کرنی ہے؟"

"سرمادائی؟" ــــ منگل نے دوہرایا اور پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے رانی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا ــــ "سچ؟"

رانی نے خفیف سا سر ہلایا، اور مسکراتے شرماتے ہوئے پرے دیکھنے لگی۔

اُسی دم چنوں، چاچی پورو، بھابھی وِدّیا، جانکی، سرو، پھوٹی رانی چینڈی ــــــ عورتوں کا غول کا غول اندر چلا آیا، تالیاں بجاتا، شور مچاتا، ناچتا گاتا ہوا:

"چُوڑے والی بانہہ کڈھ کے
مُنڈا موہ لیا تو یتاں والا"

(چوڑے والی بانہہ دکھا کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا)

"دمڑی دا سک مل کے
مُنڈا موہ لیا تو یتاں والا"

(دمڑی کی چھال ہونٹوں پر مل کر تعویذوں والا لڑکا موہ لیا)

منگل نے اُنہیں چُپ کرانے کے لئے ہاتھ اوپر کیا

"چنوں چاچی!"

پورن دئی نے آگے بڑھ کر زور سے منگل کو ایک دھکا دیا

اور بولی ــــــ "جا وے جا بڑا آیا ہے!

بہنگر بڑا" چنوں نے بھی دھکا دیا۔

"دفان ہو جا!" ــــ وِدّیا بولی "تیرا یہاں عورتوں میں کیا کام؟"

بے حیا پورو بولی: "تیرا جو کام تھا، تو نے کر دیا، اب جا اِکا چلا۔"

اور پھر رانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "لڑکا پیدا کرنا ری! ایک اور مصیبت

ے دودھ

نہ کھڑی کرلینا "

اور بھی عورتیں اندر آنے اور منگل کو دھکے دے دے کر باہر نکالنے لگیں ـــــ رانو منگل کو بچاتے ہوئے رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی ـــــ " ہائے ہائے نی رنڈیو! ہائے نی، میرا مرد ـــــ نی! بس کرو، ہائے، مار ہی ڈالوگی؟" ـــــ اور منگل سر کو بازوؤں میں دے کر اپنی عزت بچاتا ہوا، لمحہ بہ لمحہ دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ اور چلا رہا تھا ـــــ " چاچی، چنوں! جاتا ہوں، میں جاتا ہوں ـــــ میری توبہ، میرے باپ کی توبہ!" ـــــ اور وہ گرتا پڑتا، پگڑی سنبھالتا ہوا باہر نکل گیا۔

اب میدان عورتوں کے ہاتھ تھا، وہ رانو کی طرف باتیں اُلارُ اُلار کے گا رہی تھیں، ناچ رہی تھیں:

"پودینے کی کرو کڑھائی رے
ہمارا اچھا کرارا پودینہ، ہو!
مسالوں والا پودینہ، ہو!"

اور وہ پاگل ہو رہی تھیں۔ اُن کے گانے اور ناچ کی رفتار تھی۔ کہ کم ہونے کی بجائے تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اُن کے شور میں کان پڑی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ اِس پر بھی رانو نے پورو کو پرے لے جا کر کہہ ہی دیا۔

"بدھائی کس بات کی ؟" پورن دئی نے اپنی ڈھیلی ہوتی ہوئی دھوتی کو کستے ہوئے کہا:

"بڑی کیلئے برل گیا !"

بڑی جو دروازے میں کھڑی تھی، مرچ کی طرح لال ہو کر، اندر سٹک گئی۔ اور عورتیں، جن کی نظروں کے افق پر ہمیشہ دولھے رہتے ہیں اور نیچے دولہنیں، جن کے کان شہنائی کی آواز سننے کے لئے شہوانی آنکھیں براتیں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں، ایک دم بے خود اور پاگل ہو اُٹھیں ـــــ ابھی سے اُنھیں بڑی کی برات دکھائی دینے، باجے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ اُنہوں نے تو یہ بھی نہ پوچھا ـــ لڑکا کون ہے ؟ کہاں رہتا ہے ؟ کیا کام کرتا ہے ؟ اُنہیں تو زرتار سہرے لگائے، سر پر کلغی سجائے، ہاتھ میں تلوار لئے، گھوڑی پر چڑھا ہوا دولہا نظر آرہا تھا۔ اور ساتھ جانوروں، بندروں اور سوَروں کی برات جو پھٹے پرانوں میں سے اُن کا جوبن لُوٹے جارہی تھی۔ اور اب وہ گارہی تھیں:

"واڑ تھلّے دو نمبو پکّے
جیٹھ منگے اُدھارے"

(باڑ کے نیچے دو نیمبو پکّے ہیں ـــ جیٹھ اُدھار مانگ رہا ہے)

"نہ میں جیٹھا ملے دیندی
نہ دیندی رکھوارے"

ڈنڈیاں نوں ول پے گیا
جھمکے لین ہلارے"

(اے حبیبہ! نہ میں مول دیتی ہوں، نہ رکھنے کے لئے ـــ نازک بالیوں کو بل پڑ گیا ہے اور جھمکے جھولنے لگے ہیں)

ایک اور نے شروع کیا:

"سوہریا، بدام رنگیا"

نونہاں گوریاں، ـــ پُتر تیرے کالے"

(اے بادام کے رنگ والے سُسر! تیری بہوئیں گوری ہیں ـ (لیکن) بیٹے کالے)

وہ اپنے تصور میں دُنیا بھر کی دُلہنوں کو اُن کی سُسرال پہنچا چکی تھیں۔

اِس شور کی وجہ سے دیوی ماں کے درشنوں کو آئی ہوئی پوری پرکرما، منگل کے گھر کی طرف پلٹ پڑی ـــ جیسے دیوی ماں مندر میں نہیں، وہاں ہے، یا جیسے مندر وہاں چلا آیا ہے جہاں خلقت ہے۔ گیان چند سرپنچ، تارا سنگھ نمبردار، کیسر سنگھ، جگو، رلدو، دیوانا، کرمو، دُلا، جمالا ـــ سب آکر کھڑے ہو گئے ـــ کوٹھے پر عورتوں کے ٹھٹ نظر آنے لگے، نیچے مردوں کے ـــ اڑوس پڑوس اور باہر گاؤں کے

لوگوں کے علاوہ سرمادائی بھی آئی تھی، جو ساری دُنیا کو دُنیا میں لائی تھی اور اب اوروں کو بھی لانا چاہتی تھی۔

جہلم کی تینوں بیٹیاں، عنایتی، عائشہ اور سلامتی بھی چلی آئیں۔ ساتھ جہلم کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تھا، مولو، جس کے بے خود، بے لبس اشاروں کی طرف دیکھ کر سلامتی شرما رہی تھی، بر مار رہی تھی ـــــ پھر نواب کی بیوی، عائشہ، گوردا س کی بیوی گن وتی، سب اگلی پچھلی کدورتیں بھول کر اس لمحے میں کھو گئیں۔

پورو اور ودیا نے رانی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا۔ ان سب کے درمیان ڈبو پاگل ہوا گھوم رہا تھا۔ اِسے اُسے سب کو سونگھ رہا تھا، بے تحاشا دُم ہلا رہا تھا ـــــ رانو کچھ احتیاط، کچھ بے احتیاطی سے ناچ رہی تھی ـــــ اُس کے گلبرے کی شلوار، معلوم ہوتا تھا کوڑیالے رنگ کا کوئی سانپ ہے، جو لٹپٹا، بل کھاتا ہوا، اوپر ہی اوپر جا رہا ہے ـــــ رانو، جس کا مصیبت میں دبا ہوا حُسن آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا، پھانٹوں والے کُرتے کے بیچ سے آنکھیں مارنے، چندھیانے، خیرہ کرنے لگا، جیسے کوئی شیطان بچہ ہاتھ میں آئینہ لئے آتے جاتوں پر سورج کی روشنی کا عکس لپکائے اُن کی آنکھیں چُندھیائے، بار بار اندھا کئے جائے۔

ناچتی ہوئی عورتوں کی نگاہوں میں دُنیا ایک وسیع و عریض دائرہ

بن گئی جس کے بیچ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے صرف خاکے تھے۔ پھر وہ بھی رنگ کے بڑے بڑے جھنیٹوں اور دھبوں میں بدل گئے اور آخر ایک ہی رنگ رہ گیا ——— سورج کی کرنوں کا رنگ، جس میں سب ہی رنگ چھپے رہتے ہیں اور الگ الگ پہچانے جانے کیلئے انسان کے دماغی منشور کے محتاج و منتظر۔

باہر کچھ اور ہی شور مچا اور یہ غول کا غول، جھرمٹ کا جھرمٹ، کئی نئے رنگ پیدا کرتا، ایک دوسرے پر گرتا پڑتا دروازے پر کوٹھے کی منڈیر پر کنویں کے من پر پہنچ گیا۔

یہ جاتری لوگ تھے، جو سر جھکائے دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے آ رہے تھے۔ ڈھولک پیٹتے، چھینے بجاتے ہوئے دیوی ماں کی استتی گا رہے تھے۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے چلے آئے تھے: گناہ جو ہو چکے تھے ——— گناہ، جو ہو رہے ہیں ——— گناہ جو ہونے والے ہیں۔

وہ ناچ رہے تھے، گا رہے تھے:

"ماتا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں
میا رانی دے دربار، جوتاں جگدیاں
ہے میاں تیں تے بہناں گوریاں

سرلال پھلاں دیاں جوڑیاں
ماتا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں"

پھر منظر کھلا اور سب نے دیکھا چودھری مہربان داس اور اُس کا بھائی گھنشام سات سال کی قید کاٹ کر آرہے تھے ـــــ شور مچاتے اور حال کھیلتے، جاتریوں کے پیچھے بھیڑیں اُن کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی ـــ کریں سجدوں سے دوہری اور کان توبہ اور شرم سے لال ـــ صدیوں کے خشوع اور خضوع کے بعد اب اُن کے ہونٹوں پر چپ چلی آئی تھی، اور ان کی یہ چُپ داستانیں کہہ رہی تھی۔

اور اِن سب کے بیچ ایک لڑکا تھا، پچیس چھبیس برس کا، گھبرو، جوان، خوبصورت، جو اِس وقت بڑے آرام، بڑے پیار، بڑی ہی محبت، اور عقیدت سے دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا ـــ اُسے دیکھ دیکھ کر لوگ حیران ہو رہے تھے۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا، ایک ہی تجسس ـــ اتنی چھوٹی سی عمر میں، اِس لڑکے نے کون سا گناہ کیا تھا؟ شاید گناہ اِس نے نہیں، گناہ نے اِسے کیا تھا۔

جب ہی بھیڑ کو چیرتا، دھکے دیتا، دھکے کھاتا ہوا منگل رانی کے پاس چلا آیا اور اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتا ہوا بولا ـــ "رانو! وہ ہے ..... وہ ہے لڑکا" ـــ اور اُس نے بھینٹیں گاتے ہوئے

لڑکے کی طرف اُنگلی اُٹھائی۔

رانو نے دور سے اُس خوبصورت لڑکے کی طرف دیکھا، اور اُسکی نگاہوں میں سومبر رچ گئے۔ من ہی من میں اُس نے بڑی کی بانہوں کے ہار اُسکے گلے میں پہنا دیے اور خود امربیل بنی اُس سے لپٹ لپٹ گئی اتنا جوان، اتنا سجیلا گبھرو نہ ملا ہوگا کسی ماں کی بیٹی کو ——— محبت کے جوش میں دیوانی ہوتی ہوئی رانی نے پاس کھڑی چنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے اُسے بھینچتے، اُس کی چیں بُلا تے ہوئے بولی:

"ہائے نی چنوں، میں تو پار ہوگئی"

بڑی بھی عورتوں کے جھرمٹ میں سے سر نکال کر لڑکے کو دیکھ رہی تھی ——— آپا دھاپی کی اِس بھیڑ نے اُس کی سب شرموں کو چھپا لیا تھا۔ لہو پورے بدن سے کھنچ کر اس کے منہ کو آنے لگا تھا۔ وہی لہو سلامتی کے چہرے سے غائب ہوگیا اور وہ اپنی بڑی بہن سے کہنے لگی:

"آپاں گھر چلیں ——— میں تو تھک گئی۔"

اور رانی اِسے اُسے سب کو اپنا کھلونا دکھا رہی تھی: ——— "دیکھا چاچی؟ وِدّو، تو بھی دیکھ ——— دیکھ چنڈیے! ——— رنڈیے، لاجو ....."

پورو چاچی نے دیکھا، وِدّیا نے جانچا، چنڈی نے تولا۔ لاجو، جانکی، ککی ..... اور رانی سب کی طرف دیکھتی، سر جھٹکتی ہوئی بولی: "ہے نا؟"

جب ہی رانی کی نظروں کی کڑی ٹوٹ گئی۔ اُس نے دیکھا، چنوں کے چہرے کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا۔ اِسی بے بہارے، توریے کے پھول کی طرح۔ رانی نے ایک تیز سی نظر اُس پہ ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہائے نی" اور پھر اسی نظر سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی، جواب تک قریب آچکا تھا اور نظروں کی جھولیاں پھیلائے، ہاتھ جوڑے رانی سے کوئی بھیک مانگ رہا تھا۔ رانی نے ایک دم سانس اوپر کھینچی:۔۔۔ "میں مرگئی!"

سانس باہر آنے سے پہلے، رانی کے چہرے کی سُرخی صاف اور سامنے پر لگا کر اُڑتی ہوئی نظر آئی اور وہ روئی کی طرح سفید ہوگئی پہلے ہاتھ کانپنے پھر پورے کا پورا بدن تشنجی ہوگیا۔ اور وہ لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی:

"وہی ۔۔۔ یہ تو وہی ہے جس نے میرے..."

رانی اِس ناگہانی صدمے سے بے ہوش ہوکر گرنے ہی والی تھی کہ صدیوں کے سُترگ سے سفید اور سر افگندہ حضور سنگھ کہیں سے گرتا پڑتا چلا آیا۔ اور قریب کھڑی جنداں بوڑھی سے بے پرواہ ہوکر اُس نے رانی کو گرنے سے تھام لیا۔ آج اُس کی آنکھیں جوہڑ پہ نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے کی بجائے پورے پر تول رہی تھیں، شاہین صفت بلند آشیانوں کی طرف اُڑ رہی تھیں۔

"بہو" اُس نے لرزتے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے کہا۔ "تو کیسے روتی ہے؟ میری طرف دیکھ، جس نے بٹیا دیا ہے، ہمیشہ بٹیا

دیا ہے، جب نہیں جا کے ایک بیٹا پایا ہے۔"

اور پھر بھورانی کی روح کو پا لینے کے جتن میں بڑھا حضور سنگھ خود کہیں کھو گیا۔ اُس کی آنکھوں کی گنگا جمنا، اُس کی ڈاڑھی کے جنگل بیلوں میں گُم ہو رہی تھیں۔ تلو کے کی موت کے بعد آج تک اُس کے ہاتھ، کسی نہ ہاتھ آنے والی چیز کی تلاش میں کھپ گئے تھے۔ آواز گلے میں کانپتی رہ گئی تھی ـــــــ

"نہیوں لبھنے لال گواچے

مٹی نہ پھرول جوگیا...."

(جوگی! بے کار کی خاک مت چھان' لال جو ایک بار کھو گئے، سو کھو گئے، اب وہ تجھے نہیں ملیں گے، ہاں لال کے بدلے تجھے لال مل جائیں گے، ہیرے مل جائیں گے، موتی، پنّے ـــ پر وہ لال؟ ـــــــ نہیں)

جب ہی تو حضور سنگھ کی آنکھیں اِس دُنیا کے رشتوں اور بندھنوں میں کہیں رُل گئی تھیں اور نظارے اس کی بے بسی پر رو رہے تھے، اب وہ خود نظارہ تھا اور خود ہی ناظر، آپ تماشا اور آپ ہی تماشائی ـــــــ اُس کے سر پہ گیروے رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے پیچ کُھل کُھل جاتے تھے، اِس وقت پلّو سے وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اور رکیک سی ناک پونچھتا ہوا کوئی جوگی، کوئی رمتا رام معلوم ہو رہا تھا ـــــــ وہ دُنیا کو چھوڑ رہا تھا۔ پر دُنیا اُسے نہیں چھوڑ رہی تھی ...

آج موت کے دروازے پہ کھڑے اُسے کوئی دبھ درشٹی مل گئی تھی اور وہ دیکھنے لگا تھا، جنم مرن ـــــ اور بیچ میں ایک رانی بہو، جو شادی کے روز ایکا ایکی کہیں کتم عدم سے معرض وجود میں چلی آتی ہے اور پھلکاری کے پیچھے سے اپنی کلیروں سے اَٹی، لال لال چوڑیوں سے پٹی، گوری گوری باہیں نکالتی، چھنکاتی ہے۔ مہندی کی خوشبو سے بوجھل ہاتھ جوڑتی، گھونگھٹ کی اوٹ سے، نیم نگاہی کی زبان میں منتیں کرتی، اپنے سسر سے کہتی ہے: ـــــ "پتامہ! تو اپنا ایک یہ بیٹا دے دے مجھے! میں اس کے بدلے تجھے دس دوں گی۔ اسی کی شکل میں، اسی کی عقل میں۔" اور پتامہ کہتا ہے: ـــــ "ہاں، ہاں، بیٹی! پر یہ بیٹا میرا ـــــ؟" اور پھر وہ آنسو پونچھتا ہوا مُنہ پھیر لیتا ہے!

رانی کے لانبے لانبے کیش، حضور سنگھ کی اُنگلیوں سے اُمڈنے والی شفقت کے سیل میں نہا رہے تھے، چھینٹے اُڑا رہے تھے۔ آج اُسے اپنے کھوئے ہوئے باپ کی جگہ کوئی آسمانی باپ مل گیا تھا، اِسی لئے ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز وہ بار بار اپنا سر اُسکی چھاتی پہ ٹیک رہی تھی اور کہہ رہی تھی "نہیں..... نہیں باپو، یہ نہ ہوگا۔ ہائے، میری بیٹی! میں مرجاؤں گی، باپو..."

اُس وقت پرکرما کے لئے آئی ہوئی ساری خلقت تھم چکی تھی، اور رُکے ہوئے سانسوں سے ایک عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی تھی ـــــ معلوم ہوتا تھا رانی "ہاں" کہے گی تو دُنیائیں بس جائیں گی اور "نہ" کہے گی تو پرلے (قیامت) آجائیگی،

——— مہاپرلے، جس میں کیا انسان اور کیا حیوان، کیا پشو اور کیا پنچھی، کیا دھرتی اور کیا آکاش، سب ناش ہو جائیں گے، سمے کے پاس کوئی نوح نہ رہے گا، اور خدا کے پاس کوئی ردح، شبد میں جھنکار نہ رہے گی، جیوتی میں پرکاش نہ رہے گا۔

——— اور منچ پر مشیر سامنے کھڑے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوئی دُعائیں مانگ رہے تھے اور اُن کی دُعاؤں میں یہ سیدھا سادھا، معصوم منگل بھی شامل ہو گیا تھا۔

جب ہی رانی کو دلاسا دیتے ہوئے حضور سنگھ بولا ——— "بیٹا! یہ سب کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے؟ اِسے تو نہیں جانتی، نہ میں جانتا ہوں، نہ یہ لوگ جانتے ہیں ——— تو اِسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر ——— ایک چُپ ——— یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں ..."

رانی نے مُڑ کر دیکھا ——— بڑی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں وہ کہہ رہی تھی ——— "ماں! یہ تو کیا کر رہی ہے؟ تو نہ بولی تو میں بن بیائی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی۔" رانی نے سُسر کے کاندھے پر سے سر اُٹھایا، اور بولی:

"اچھا باپو! ——— اچھا"

ایک دم بھینٹیں شروع ہو گئیں۔ لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ گانے، بجانے، شور مچانے لگے، جن کے بیچ رانی نے اوپر مندر کی طرف

دیکھا ـــــ سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اُسے منور کر رہا تھا ... تھوڑی ہی دیر میں رات ہو گئی اور اندھیرا چھا گیا۔ اُس پہ بھی ایک تیز، چکا چوند کر دینے والی روشنی تھی جو جھپک جھپک کر، لپک لپک کر رانی کی طرف آ رہی تھی اور جس نے پوری طرح سے اُس کے بدن کا احاطہ کر لیا تھا ـــــ

اُسی دم مندر میں گھنٹیوں کا غوغا مچا، مسجد سے اذان بلند ہوئی اور جہاں کلس تھے، وہاں اندھیرے میں کسی کے ہاتھ پھیلے اور گردن لٹکتی ہوئی نظر آئی۔

ایک ڈر تھا، اور ایک حظ بھی، جن میں سنسناتی ہوئی رانو نے اپنے دونوں ہاتھ کلسوں کی طرف اُٹھا دئے اور روتی دھوتی، لرزتی کانپتی ہوئی بولی:

"ماں ـــــ ! ہے دیوی ماں !"

جب ہی وڈیلا نے پورو کی کمر میں ٹھوکا دیا ـــــ "ایتے پورو! سب ہی آئے، ایک تیرا ہری داس نہیں آیا؟"

اور پورو جھوٹ موٹ روتی ہوئی اپنے شمبھو کے حرامی باپ کا ماتم کرنے لگی...

(مہندر کاتب دہلوی)